متعلقاتِ کالی داس گپتا رضا

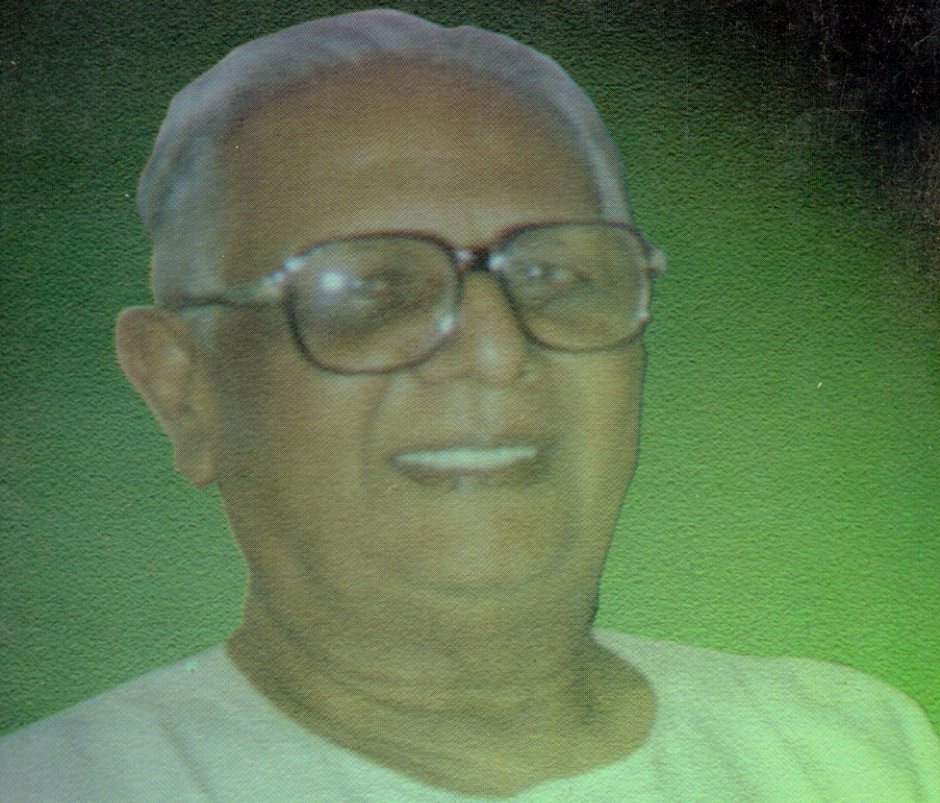

ساحرؔ شیوی

متعلقاتِ کالی داس گپتا رضاؔ

(مضامین)

ساحرؔ شیوی

بزمِ تخلیقِ اَدب پاکستان۔ کراچی
پوسٹ بکس نمبر 17667، کراچی 75300

© SAHIR SHIWEE

47, Sutton Garden, Sundon Park,
Lutonbeds, LU3 3AF, U.K.
Phone 01582-704633

کتاب: متعلقات کالی داس گپتا رضا
مصنف: ساحرؔ شیوی
اشاعت: اپریل 2000ء
تعداد: پانچ سو
کمپوزنگ: فرید گرافکس۔ کراچی
کمپوزر: سید اسعد ہاشمی
مطبع: ندیم پرنٹنگ پریس۔ کراچی
قیمت: -/150 روپے، برطانیہ میں 5 پونڈ
ناشر:

بزم تخلیق ادب پاکستان، کراچی
پوسٹ بکس نمبر 17667، کراچی۔ 75300

انتساب

وسیم بٹ وسیم

کے نام

جو اچھا شاعر، بہت اچھا انسان

اور

میرا بہترین دوست ہے

مشرقی افریقہ میں اردو کی شمع اب اسی کے دم سے فروزاں ہے

فہرست

پیش لفظ	ساحر شیوی	7
سب پر ہیں غالب	سید معراج جامی	15

مضامین

1. پہلی ملاقات 19
2. نعت گو 35
3. بحیثیت رباعی گو 41
4. مذہبیات کا رچاؤ 53
5. حیات، موت اور تناسخ 65
6. تین نظمیں، ایک تجزیہ 73
7. میرے کلام پر چند اصلاحیں 81
8. کچھ برجستہ اشعار 89
9. رضا صاحب کے خودنوشت دیباچے 123
10. کچھ ہنگامی کلام 145
11. رضا صاحب بنام ساحرؔ 159

پیش لفظ

گزشتہ چند برسوں سے عمر کے ساتھ ساتھ رضا صاحب کی شاعری میں ایک انقلاب سا آگیا ہے۔ خیالات اور پختہ ہوگئے ہیں۔ احساسات اور گہرے خیالات کی صحیح نقاشی اور تاثرات کی مکمل صورت ملنے لگی ہے۔ ندرت بیان۔ پرواز تخیل اور حسین استعاروں کی دلفریبی دو چند ہوگئی ہے۔ آگہی حق بینی اور فطرت شناسی کے نمونے جو انسانیت کے روشن پہلو ہیں آپ کے ہاں کثرت سے ملتے ہیں۔

افریقہ کی پچیس سالہ زندگی میں انہوں نے صرف شاعری ہی نہیں کی بلکہ یہاں کئی شاعر بھی پیدا کیے۔ پتھروں کو زبانیں بخشیں۔ بولنا سکھایا۔ فن شعر و سخن کو محفلوں میں اجاگر کیا۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک باکمال مصلح بھی ہیں۔ انہیں فن عروض پر پوری طرح دسترس حاصل ہے۔ جب بھی نیروبی میں مشاعرہ منعقد ہوتا ایک دو روز قبل ان کے دولت خانے پر مبتدیوں کا ایک ہجوم سا رہتا۔ مبتدی اپنی غزل پڑھتے جاتے اور رضا صاحب فوراً" نہایت چابک دستی سے اس کی اصلاح فرماتے جاتے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے شاگردوں کو کبھی شاگرد نہیں سمجھا۔ اپنا دوست سمجھتے رہے۔ شاگردوں پر کبھی اپنا رعب نہیں جمایا۔ حسن سلوک کوئی ان کے یہاں دیکھے۔ میں ان کے اخلاق و عادات کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں انہیں ایک مدت سے جانتا ہوں' ان کے دولت خانے پر گھنٹوں بیٹھا ہوں۔ ان کے ساتھ بحث و مباحثے ہوتے رہے ہیں۔ ان کے مشرقی افریقہ آنے کے بعد محفلوں اور مشاعروں میں بے حد باقاعدگی آگئی تھی۔ لوگوں کا ادبی ذوق اس قدر نکھر گیا تھا کہ اگر کچھ عرصے تک کوئی بزم سخن منعقد نہ ہوتی تو شائقین شعروادب کی جانب سے اصرار شروع ہو جاتا۔ رضا صاحب کے دولت خانے پر ہر ماہ محفل مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ اکثر دو دور ہوتے تھے۔ ایک طرحی اور دوسرا غیر طرحی۔ رات کے بارہ

بجے تک محفل گرم رہتی۔ ایک دور ختم ہونے کے بعد رضا صاحب کی جانب سے پر تکلف چائے کا انتظام ہوتا۔ تمام مصارف وہ اپنے جیب خاص سے ادا کرتے تھے۔ مشاعرے میں ایسے اصحاب کو مدعو کیا جاتا جنہیں شعروادب سے واقفیت اور دلچسپی ہو۔

پاکستان سے ایک دفعہ ماہرالقادری صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ انہوں نے بھی رضا صاحب کی ان محفلوں میں دو بار شرکت کی۔ - مشاعرے کی شائستگی اور رکھ رکھاؤ دیکھ کر ماہرالقادری صاحب بھی بھری محفل میں یہ کہنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ لکھنؤ اور دہلی کی محفلیں آنکھوں میں رقص کرنے لگی ہیں۔ رضا صاحب کا کلام سن کر انہوں نے فی البدیہہ یہ شعر کہا تھا:

جہاں میں ایسے انسان بھی کہاں ہیں رضا شاعر ہیں اور شیوا بیاں ہیں

1970ء میں رضا صاحب افریقہ کی جنت جیسی دھرتی کو خیرباد کہہ کر وطن چلے گئے۔ ان کے پیش نظران کی کچھ مجبوریاں تھیں۔ کچھ یہاں کی فضا ناسازگار سی ہوتی جا رہی تھی۔ کینیا کی دھرتی غلامی کی زنجیریں توڑ چکی تھی اور یہاں کے باشندوں کی نظروں میں ہماری ہستی خار بنتی جا رہی تھی۔ ہو سکتا ہے یہی وجہ ہو رضا صاحب کے ترک افریقہ کی۔ انہیں اس دھرتی کو چھوڑنے کا قلق ضرور ہوا ہوگا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے جانے کے بعد مشرقی افریقہ میں اردو شعروادب کا چراغ دم توڑ دے گا۔ اور یہ ثابت ہو کر رہا۔ آجکل یہاں مشاعرے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سال میں ایک دو بار کسی خاص موقع پر مشاعرے اور محفلیں ہوتی بھی ہیں تو ان میں دلچسپی اور باقاعدگی کا نام نہیں ہوتا۔ جو ماسٹر آف سیرمنی ہوتا اس کے ہاتھ میں خدائی آجاتی۔ 31 دسمبر 1969ء کو رضا صاحب کے اعزاز میں سرعلی مسلم کلب میں ایک عظیم الشان مشاعرہ کیا گیا تھا۔ اس مشاعرے کی صدارت سابق ممبرپارلیمنٹ جناب خواجہ ظفرالدین صاحب نے کی۔ راقم الحروف نے اس مشاعرے میں رضا صاحب کے اعزاز میں کچھ قطعات کہے تھے۔ ان میں چند پیش کرنے کا مقصد یہی ہے کہ رضا صاحب کا مقام اور جذبہ محبت جو ہم لوگوں کے دلوں میں تھا اس کا اندازہ ہو سکے۔

اس کی اوروں سے صبح و شام الگ　　اس کی مے بھی الگ ہے جام الگ
کی رضا نے نہ غیر کی تقلید　　اس کے شعروں کا ہے مقام الگ

○

دکھ اٹھاتا ہے رنج سہتا ہے　　وہ غریبوں کے دل میں رہتا ہے
خوف کھاتا نہیں امیروں سے　　بات ہر دم پتے کی کہتا ہے

○

اس کے الفاظ میں نفاست ہے　　اس میں فنکاروں کی شرافت ہے
کام اس کا ہے خدمت اردو　　اور ادب اس کو اک عبادت ہے

○

نام کو بھی نہیں غرور اسے　　سب سے ملتا ہے آدمی کی طرح
شاعری ہند و پاک تک مقبول　　خود بھی مقبول شاعری کی طرح

○

افریقہ میں اس کے جانے سے　　کہیں شمع سخن نہ بجھ جائے
فن شعر و ادب کے گلشن میں　　ڈر ہے ساحر خزاں نہ آ جائے

○

وہ ہمارے امیر کارواں تھے۔ ہمیں ان کے جانے کا بے حد افسوس تھا۔ ہمارے کارواں سے بچھڑ جانے کا بڑا دکھ تھا۔ اور یہاں کوئی ایسا موجود نہیں تھا جو ان کی خلاء کو پر کرسکے۔ شعرو سخن کے راستے پر بے باکانہ اور بلا جھجک آگے بڑھا سکے۔

رضا صاحب نے "شعلہ خاموش کے التماس نامہ" میں لکھا ہے کہ مشق نہ ہونے کی وجہ سے مجھے اردو نثر لکھتے ہوئے سخت الجھن ہوتی ہے۔ میں محض ایک شاعر ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ افریقہ کی بیس سالہ زندگی میں وہ نثر کی جانب بہت کم راغب ہوئے شاید ان کی عدیم الفرصتی ان کے آڑے آتی رہی ہو۔ نثر کے لیے بہت

وقت درکار ہے اور رضا صاحب اعلیٰ درجے کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے بزنس مین بھی تھے۔ جو آدمی بزنس میں شب و روز مصروف رہے اس کے لیے نثر نگاری کے لیے وقت نکالنا بہت کٹھن ہے۔ لیکن 1970ء میں جب انہوں نے شاعری کی بجائے نثر نگاری کی طرف زیادہ توجہ دی۔ "شاخ گل" کو چھوڑ کر ان کے جو مجموعے منظر عام پر آئے ان میں تقریباً تمام کلام افریقہ ہی کا کہا ہوا ہے۔ "شاخ گل" میں بھی چند نظمیں صفحہ 16 سے لے کر صفحہ 47 تک نیروبی کی کہی ہوئی ہیں۔ مگر وطن میں آباد ہونے کے بعد ان کی تین کتابیں نثر ہی میں شائع ہو کر قابل داد و تحسین ٹھہریں۔ ہندوستانی مشرقی افریقہ کی پہلی جلد۔ مکتوبات جوش ملسیانی بنام رضا اور دعائے صباح نثر نگاری کے اعلیٰ نمونے ہیں مختلف رسائل میں ان کے تحقیقی مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جو مشاہیر سے خراج تحسین حاصل کیے بغیر نہیں رہتے۔ ریسرچ اور تحقیقی مقالے رضا صاحب کے ایسے کارنامے ہیں جو مستقبل میں ان کے نام کو چار چاند لگا دیں گے۔ اور انہیں ہر دم زندہ پائندہ رکھیں گے۔ ان کا ماضی بھی تابناک رہا ہے اور مستقبل کے آثار بھی درخشندہ نظر آرہے ہیں۔ ماہنامہ صبح امید میں ایک عرصہ "یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ" میں قدیم مشاہیر (جن میں شعراء و ادبا) کے زندگی کے حالات اور ان کی شعرو شاعری پر نہایت بے باک اپنی رائے ظاہر فرماتے رہے ہیں اور جنہیں لوگوں نے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ " ہندوستانی مشرقی افریقہ میں" کی پہلی جلد پر اتر پردیش اردو اکیڈمی نے انہیں انعام سے نوازا ہے۔

اوپر جو کچھ درج کیا گیا ہے وہ اس مضمون کا ایک حصہ ہے جو میں نے سن 1977ء کے آخر میں لکھا تھا مگر طبع نہیں ہوا تھا۔ وہ جتنا سچ اس وقت تھا اتنا سچ آج بھی ہے۔ اس وقت تک رضا صاحب کی صرف سات کتابیں شائع ہوئیں تھیں۔

(1) شعلہ خاموش (شاعری)- (2) شورش پنہاں (شاعری)- (3) شاخ گل (شاعری)- (4) اجالے (نعتیہ کلام)۔ (5) دی سائلینٹ فلیم (انگریزی)- (6) مکتوبات جوش ملسیانی۔ (7) ہندوستانی مشرقی افریقہ میں۔ اس کے بعد 1999ء تک

تو گویا کتابوں کا انبار ہے جو ان کے قلم سے نکلا۔ ترپن (53) کتابیں طبع ہوئیں۔

مال کار رضا صاحب ایک عظیم دانشور بھی مانے گئے ہیں اور ہندوپاک میں صف اول کے ماہر غالبیات بھی تسلیم کیے گئے۔ انہیں دہلی۔ مہاراشٹر۔ یوپی۔ بہار بنگال کی اردو اکاڈمیوں کے انعامات اور میرا کاڈمی انعام کے علاوہ ذیل کے برگزیدہ انعامات سے بھی سرفراز کیا گیا۔

(1) صف اول کا غالب ایوارڈ 1989ء

(2) کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ 1996ء

(3) مہاراشٹرا سٹیٹ اردو اکاڈمی (سراج اورنگ آبادی) ایوارڈ 1997ء

(4) عالمی فروغ ادب ایوارڈ دوحہ (قطر) 1999ء

سات کتابوں کے علاوہ (جن کا حال اس کتاب میں آچکا ہے) درج ذیل کتابیں شائع ہوئیں ہیں۔

(1) گیت اور بھجن۔ (2) شعاع جاوید (رباعیاں)

(3) ODE TO EAST WIND (انگریزی کلام)

(4) شعور غم۔ (5) غزل گلاب۔ (6) نظم سمندر

(7) آسماں اکیلا (ہندی میں)۔ (8) احترام۔ (9) ابھی ناؤ نہ باندھو۔

غالبیات:۔

(1) غالبیات چند عنوانات۔ (2) آب حیات میں ترجمہ غالب۔

(3) دیوان غالب عکسی (1841ء)۔ (4) دیوان غالب عکسی (1862ء)۔ (5) دیوان غالب کامل۔ تاریخی ترتیب سے (نسخہ گپتا رضا)

(اس نسخہ گپتا رضا کے اب تک پانچ ضخیم ایڈیشن نکل چکے ہیں اس کام پر اردو دنیا جتنا بھی ناز کرے کم ہے)

(6) دیوان غالب (متداول) تاریخی ترتیب سے۔ (7) غالب درون خانہ۔

(8) غالب کی بعض تصانیف۔ (9) پنج آہنگ میں مکاتیب غالب۔ (10) غالبیات چند شخصی۔ وغیر شخصی حوالے۔ (11) اسد اللہ خان غالب مرد۔ (12) بالمکندبے

صبر تلمیذ غالب۔ (13) انتخاب رقعات و اشعار غالب۔ (14) غالبیات کچھ مطالعے اور مشاہدے۔ (15) انتخاب آتش و غالب۔ (16) تعلقات غالب۔ (17) دعائے صباح۔ (18) غالب منتخب اشعار مع شرح۔ (19) غالبیات چند عنوانات۔ (20) تفہیم غالب کے دو حروف۔ (21) کچھ غالب و غالبیات کے بارے میں۔

چکبستیات :

(1) کلیات چکبست۔ (2) مقالات چکبست۔ (3) چکبست کچھ بازدید کچھ پیش رفت۔ (4) چکبست اور باقیات چکبست۔

جوش ملسیانی:۔

(1) جوش ملسیانی حیات اور انتخاب کلام۔

(2) منشورات جوش ملسیانی۔

متفرقات:۔

(1) قدسی الہ آبادی اور غزل قدسی۔ (2) علی سردار جعفری بہنوں کی نظر میں۔ (3) فرہنگ عارفان۔ (4) بہار اردو گلشن مشرقی افریقہ میں۔ (5) کمال باکمال۔ (6) غبار کارواں۔ (7) جہاں استاد داغ دہلوی۔ (8) چار توقیتیں۔ (9) انتخاب غزلیات فراق۔ (10) ذوق۔ معتبر کوائف مستند کلام۔ (11) رفتگان کے ساتھ۔ (12) اہم غیر اہم۔ (13) حرف گیر۔ (14) حرف مدعا۔ (15) یگانے بیگانے۔ (16) رسالہ استاد شاعری۔ (17) سہو سراغ۔

ان کے علاوہ غالب و غالبیات پر اتنے ہی مضامین متفرق موضوعات پر غیر مطبوعہ۔ ان پر مستزاد غالب و غالبیات پر غالباً" دنیا کا سب سے بڑا ذخیرہ کتب و رسائل کا ہے بائیس ہزار کمیاب کتب اور رسالے۔ تذکروں اور فرہنگوں کی بڑی تعداد۔ میری نظر میں اس وقت ہندوستان پاکستان میں کم ہی ایسے اردو ادیب ہوں گے جن کو نوشت و خواند میں رضا صاحب کی ہمسری حاصل ہو۔

بے شک رضا صاحب نے اردو ادب میں مستند اور معتبر کام کے انبار لگا

دیتے ہیں۔ اردو دانشوروں نے ان کی خوب پذیرائی کی۔ میری اس

کتاب کے علاوہ دوسری کتابیں بھی رضا صاحب اور ان کے کام پر لکھی گئیں۔ رضا صاحب کی شناخت شاعری کی رہی ہے۔ اس لیے ان کے شعر کو بھی

خوب ... "کلا"

... دہلی نے آٹھ سو صفحوں پر محیط خاص نمبر نکالا۔

... ر" بمبئی نے گوشہ شائع کیا۔

... ہ "سہیل" گیا۔

... ماہنامہ طلوع افکار کراچی پاکستان۔

(5) گوشہ سہ ماہی ترسیل بمبئی اور سہ ماہی سفیر اردو لیوٹن (کوکن رائٹرز گلڈ کے رسالے)

(6) کالی داس گپتا رضا تصنیف و تالیف و شعر کی روشنی میں (از ظفر ادیب)

(7) نازش ادب کالی داس گپتا رضا (از ڈاکٹر تارا چرن رستوگی)

(8) شاعر خوش نوا (از قمر جلال آبادی)

(9) کالی داس گپتا رضا حیات اور کارنامے (پی ایچ ڈی کا تھیسس) از ڈاکٹر راہی قریشی

(10) ایک نابغہ جو ابھی پورا پہچانا نہیں گیا NOT FULLY KNOWN THE GENIUS (از پی کے نجھاون)

(11) کالی داس گپتا ایک نہ تھکنے والا قلم کار A TIRELESS PEN-MAN (از سرسوتی سرن کیف)

(12) ذکر رضا (از عابد باندوی)

(13) رضا اور غالبیات شین کاف نظام پیش کنندہ ساحر شیوی

(14) شعریات گپتا رضا (از متر نکودری)

(15) کالی داس گپتا رضا بحیثیت ماہر غالب وغالبیات (از ظفر ادیب مولف ساحر شیوی)

(16) کالی داس گپتا رضا بطور غالب شناس (تھیسس) از عظمہ کالج لاہور

(17) کالی داس گپتا رضا بطور شاعر (تھیسس) از نرگس مفتی گورنمنٹ کالج گورنمنٹ

(18) دانشور گپتا رضا (از اعجاز سیمابی)

(19) جہان گپتا رضا (نذیر فتح پوری)

(20) گپتا رضا کی موضوعاتی یادداشتیں (از نذیر فتح پوری)

(21) گپتا رضا شخص اور شاعر (مولف ساحر شیوی)

(22) متعلقات کالی داس گپتا رضا (از ساحر شیوی)

اس کتاب میں جو "متعلقات کالی داس گپتا رضا" کے نام سے آپ کے سامنے ہے میں نے رضا صاحب کی نثر کے بارے میں کچھ نہیں لکھا سوائے ایک باب کے جو خود نوشت دیباچے کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے۔ ان کی شاعری کا بھی سیر حاصل تجزیہ نہیں کیا جاسکا ہے کیونکہ کتاب (1977ء) یعنی سات تصانیف تک ہی محدود ہے۔ اس میں البتہ دو باب میرے کلام پر اصلاحیں اور بنام ساحر (رضا صاحب کے خط میرے نام) زمانہ حال تک محیط ہیں۔ اس کے باوجود میں نے تساہلی کے سبب اور کچھ اس لیے کہ 1977ء کے بعد رضا صاحب کی علمی' ادبی اور تخلیقی جہتیں بالکل مختلف ہو گئی ہیں۔ میں نے اس کتاب کو چوں کہ شائع کرنا مناسب سمجھا۔ میری کوشش رہے گی کہ رضا صاحب کی بعد کی چار درجن تصانیف کا جائزہ بھی جلد پیش کروں۔

رضا صاحب نے اپنے استاد کے دائرہ عمل اور کام پر چار کتابیں لکھیں۔ میری بھی دلی تمنا ہے کہ میں اپنے کرم فرما استاد محترم کالی داس گپتا رضا کے فیضان کو وقت وقت پر حوالہ قلم کرتا رہوں۔ ایسے بے تعصب کشادہ دل صاحب علم وہنر روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

ساحر شیوی

سید معراج جامی۔ کراچی

سب پر ہیں غالب

انسان کے ساتھ کبھی کبھی اس کی زندگی میں ایسے عجیب و غریب اتفاقات ہوتے ہیں کہ جب کبھی ان اتفاقات پر غور کیا جاتا ہوگا تو عقل دنگ رہ جاتی ہوگی۔ اگر اتفاق میں حسن اتفاق بھی شامل ہو جائے تو وہ اتفاق زندگی کا ایک حسین واقعہ بن جاتا ہے، جو زندگی کا حوصلہ، جینے کی امنگ اور نئے رشتوں کا اعزاز بن جاتا ہے۔

ساحر شیوی سے ملتے وقت ہم دونوں کے ذہنوں میں کب یہ بات ہوگی کہ ہم دونوں شعر و سخن کے حوالے سے قبل از ملاقات پہلے سے ایک رشتے میں منسلک ہیں۔ ساحر شیوی کے ذریعے پہلے پہل جب یہ معلوم ہوا کہ ساحر کے استاد کالی داس گپتا رضا ہیں تو مجھے کالی داس گپتا رضا سے ایک غائبانہ انسیت پیدا ہو گئی۔ اس وقت یہ انسیت محض ساحر شیوی کے تعلق سے تھی مگر جیسے ہی مجھے یہ معلوم ہوا کہ گپتا جی، جوش ملسیانی کے شاگرد ہیں اور جوش ملسیانی، حضرت داغ کے تو پھر یہ انسیت بڑھ کر چاہت اور عقیدت میں بدل گئی۔

میری انتہائی خوش بختی یہ ہے کہ میں بھی گپتا جی کی طرح داغی ہوں۔ حضرت داغ، گپتا جی کے دادا استاد اور میرے پردادا استاد ہیں۔ میرے دادا استاد حضرت وحید العصر عبدالوحید بیخود دہلوی ہیں۔ گپتا جی کے استاد محترم جوش ملسیانی ہیں جبکہ میرے استاد محترم فدا خالدی دہلوی، جانشین حضرت بیخود دہلوی ہیں۔ اس طرح گپتا جی میرے چچا استاد کا درجہ رکھتے ہیں اور گپتا جی کے لائق فائق شاگرد ساحر شیوی، میرے عم زاد ہیں۔

گپتا جی سے ساحر شیوی کی معرفت جب پہلی بار قلمی رابطہ ہوا تو ان کا پہلا خط ہی اس قدر محبت سے بھرا ہوا ملا کہ مجھے خود پر رشک آنے لگا۔ پھر گپتا جی کی فیاضانہ عادت نے یک بعد دیگرے اپنی مطبوعات سے مالا مال کر دیا۔ ان کی چند کتب تو ساحر شیوی مجھے پہلے ہی بھجوا چکے تھے۔ میں نے گپتا جی کی کتابیں نہایت ذوق و شوق

سے پڑھیں۔ مختلف موضوعات بالخصوص غالب کے حوالے سے ان کے تبحر علمی کا خاصا رعب مجھ پر طاری ہوا۔ مگر ان کے خطوط میں اپنائیت کے اظہار نے ہمیشہ مجھے ایک سرخوشی دی ہے ان کے خط سے کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک دانشور کسی طالب علم سے مخاطب ہے بلکہ گپتا جی تو القاب و خطاب میں ہمیشہ اپنی برابر کا درجہ دیتے ہیں اور ان کی یہ شفقت و محبت سب پر یکساں ہے۔ یہی ان کی اعلیٰ ظرفی اور بڑائی کی پہچان ہے۔

پچھلے سال ساحر شیوی کی ماہیوں پر مشتمل کتاب "وادی کوکن" اور ساحر شیوی پر ایم فل کرنے والے طالب علم ہاشم عبدالرزاق کے مقالے کی کتابی شکل "ساحر شیوی۔ حیات اور شاعری" کی تقریب اجرا پر بمبئی گیا تو میری ایک دیرینہ خواہش پوری ہونے کی گھڑی آ گئی۔ یعنی بمبئی میں گپتا جی کے نیاز حاصل کرنے کا خواب پورا ہوا۔ ساحر شیوی، علی بکابو اور ہاشم کے ساتھ جب ہم نیپین سی میں واقع جل درشن پہنچے تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں اپنے ایک خواب کو شرمندہ تعبیر ہوتے دیکھنے والا تھا۔ میری اس اضطرابی کیفیت کا اندازہ میرے ہمراہیوں کو قطعی نہیں تھا۔ کچھ خوشی اور کچھ گھبراہٹ کے عالم میں گپتا جی کے فلیٹ کے صدر دروازے پر کھڑا دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ دروازہ کھلا۔ گپتا جی دروازے پر تھے۔ چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں اپنائیت کی چمک لیے انہوں نے ساحر شیوی کو گلے لگایا کیونکہ ساحر سب سے آگے تھے۔ میں تینوں کے پیچھے کھڑا تھا جب دروازہ کھلا تو میں مارے گھبراہٹ مزید پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ساحر کے بعد بکابو اور پھر ہاشم ملے۔ اب میرا نمبر تھا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے بڑھا لبوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر خوشی کے تاثرات لانے کی بھرپور کوشش کی اب یہ نہیں معلوم کہ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا یا میرے چہرے پر مزید یتیمی ٹپکنے لگی مگر اس کا جائزہ لینے کا وقت کہاں تھا میں نے صرف اتنا کہا کہ مجھے جامی کہتے ہیں۔ گپتا جی نے جس والہانہ انداز سے مجھے اپنے سینے سے چمٹایا ہے میں ان کی محبت کی وہ گرمی آج بھی محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے خود پر رشک آ رہا تھا کہ میں اپنے عہد میں

ایک عہد سے مل رہا ہوں۔ گپتا جی اپنی ذات میں واقعی ایک عہد ہیں۔ قدرت ان سے کیا کام لینے والی تھی یہ خود انہیں بھی اوائل عمری میں معلوم نہ تھے مگر جب انہوں نے قلم و قرطاس کے ساتھ ادبی میدان میں قدم رکھا تو ایک ناقابل تسخیر فاتح کے روپ میں میدان ادب پر چھاتے چلے گئے۔

ساحر شیوی بہت خوش قسمت ہیں جنہیں گپتا جی کی صحبت حاصل ہے بلکہ وہ تمام عقیدت مند جو خوش قسمتی سے ان کے شاگرد بھی ہیں' ان کے شاگرد خود پر جتنا فخر کریں وہ کم ہے۔ گپتا جی کی شگفتہ اور پر مزاح گفتگو اور پھر ہر موضوع پر ان کی عالمانہ اور محققانہ باتیں سننے والے کو مسحور کر دیتی ہیں۔ ہر عمر اور ہر مزاج کے لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ انتہائی مخلصانہ اور برادرانہ ہوتا ہے۔ بمبئی میں ان سے چار پانچ ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ وہ ملاقاتیں میری ادبی زندگی کے چند یادگار لمحات میں سے ہیں۔

ساحر شیوی نے جب گپتا جی پر اپنے مضامین جو انہوں نے مختلف اوقات میں لکھے ہیں' مجھے بغرض اشاعت دیئے تو میری خوشی دوچند ہو گئی کہ اس حوالے سے میں بھی گپتا جی کے "کار آمد" نیازمندوں میں شامل ہو گیا۔ ساحر شیوی نے گپتا جی کی مختلف جہت اور مختلف فکر سخن پر بڑے اچھے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ ساحر شیوی کے یہ تمام مضامین جہاں گپتا جی سے عقیدت و محبت کا بین ثبوت ہیں وہیں ساحر شیوی کے ژرف نگاہی اور تجزیہ نگاری کے مظاہر بھی۔ ساحر شیوی نے گپتا جی پر یہ مضامین لکھ کر ایک طرف اپنے استاد گرامی کے نمک کا حق ادا کیا ہے تو دوسری طرف اپنی تحریر کو اعتماد و اعتبار بھی بخشا ہے۔

بحیثیت ناشر مجھے "متعلقات کالی داس گپتا رضا" کی اشاعت پر خوشی بھی ہے اور گپتا جی کے حوالے سے میری ایک اور خواہش کی تکمیل بھی ہو رہی ہے کہ میں گپتا جی پر اپنے ان تاثرات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کردوں جو ان سے ملاقاتوں کے بعد میرے دل میں پرورش پا رہے تھے اور کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھے۔

غالب کی ناموری میں اس کی خوش قسمتی کا بھی بڑا دخل ہے۔ غالب واقعی

بہت خوش قسمت تھے کہ ان کو بے پناہ چاہنے والے ان کے عہد ہی میں نہیں بلکہ بعد میں بھی ملے اور ان کے عقیدت مندوں کا ایک کارواں بنتا چلا گیا جس میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ غالب کی خوش بختی کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو گا کہ جہاں ان کو عبدالرحمٰن بجنوری اور میرزا یاس یگانہ چنگیزی جیسے حلیف اور حریف ملے وہیں ان کے شارح، مفسرین اور تجزیہ نگاروں میں کالی داس گپتا رضا بھی ہیں جو غالبیات میں یقیناً" ایک بڑا نام ہے۔ بلکہ اس وقت گپتا جی ماہر غالبیات میں سرفہرست ہیں۔ گپتا جی کے اس اعزاز پر میں نے ان کی خدمت میں ایک سین ریو نذر کی تھی کہ۔

غالب کے طالب
سب ہیں لیکن گپتا جی
سب پر ہیں غالب

پوری ادبی دنیا اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کرتی ہے کہ سب سے بڑا ذخیرہ غالب گپتا جی کے پاس ہے۔ گپتا جی نے غالب پر کئی انداز سے اتنی وقیع، معلوماتی، تحقیقی اور دلچسپ کتابیں لکھی ہیں جن کا ہر صاحب ذوق اور اہل علم کے پاس ہونا انتہائی ضروری ہیں۔

گپتا جی پر ویسے تو کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور کئی جرائد کے نمبر بھی شائع ہوئے ہیں جن کے مطالعہ سے گپتا جی کی ذاتی، سماجی، کاروباری اور ادبی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ قاری کی نظر سے رہ گیا ہو تاہم ساحر شیوی نے ان کے افکار اور ان کی تخلیقات کے تناظر میں جو مضامین قلم بند کیے ہیں ان کی روشنی میں گپتا جی کی شخصیت مزید واضح ہو کر سامنے آ گئی ہے۔ "متعلقات کالی داس گپتا رضا" کے مطالعہ سے قارئین یقیناً" گپتا جی کے بارے میں بہت کچھ جان جائیں گے اور یہ بھی کہ شوق، لگن، جذبہ صادق اور چاہت کیا ہوتے ہیں اور عاشق، دیوانہ اور سودائی کسے کہتے ہیں۔

پہلی ملاقات
(شخص اور شاعر)

آج سے تیرہ سال قبل کی یاد میرے ذہن میں اب تک تازہ ہے۔ جب کہ میں 18 مارچ کو ترک وطن کرکے تلاش روزگار میں ممباسہ (مشرقی افریقہ) کی بندرگاہ پر اترا تھا اور میرے سامنے نیا ملک تھا۔ نئے لوگ تھے۔ نئی زبان تھی' نیا ماحول تھا۔ کتابوں میں افریقہ کے متعلق بہت کچھ پڑھا تھا اور لوگوں سے بھی سنا تھا۔ میں نے اسی خاک کے قدم لیے۔ اس وقت میری عمر 18 سال کی تھی اور میری شاعری کی صرف تین سال۔ ممباسہ سے اپنے احباب و اقارب کے ہمراہ تین سو میل کی دوری پر نیروبی پہنچا۔ خیال تھا کہ نیروبی ہی میں مستقل سکونت ہوگی۔ مگر چھ سات ماہ یہاں رہنے کے بعد تلاش روزگار نے کسمو پہنچا دیا (جو کینیا میں لیک وکٹوریہ کے کنارے واقع ہے) افریقہ میں میری زندگی کا زیادہ تر حصہ یہیں بسر ہوا۔ اور میری شاعری نے یہیں ہاتھ پاؤں نکالے۔

کسمو میں چھ سات سال اس طرح گزرے کہ نہ کوئی ادبی مشغلہ اور نہ کسی ادیب و شاعر سے واسطہ۔ رات دن کام میں کولھو کے بیل کی مانند جٹا ہوا' ایک گھٹن سی محسوس ہوتی۔ زندگی پھیکی پھیکی سی معلوم دیتی۔ محض زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ البتہ نیروبی سے کبھی کبھار ریڈیو پر مشاعرے نشر ہوا کرتے تھے۔ جو میں بڑے شوق سے سنا کرتا تھا اس زمانے میں نیروبی میں اگرچہ مبتدی تھے مگر کافی شعراء تھے۔ اور بڑی چہل پہل رہا کرتی تھی۔ لیکن میں ان ادبی مشاغل سے دو سو میل دور تھا۔ کبھی ایسا موقع نصیب نہ ہوسکا تھا کہ مشاعرے میں شریک ہوں۔ مشاعرے بزم سخن نیروبی کے

زیر اہتمام ہوا کرتے تھے۔ جس کے روح رواں صدر محترم کالی داس گپتا رضا تھے اور سکریٹری مومن علی حیدری۔ رضا صاحب نے بزم سخن نیروبی کے ذریعے جو خدمت کی وہ قابل ذکر ہے اور ناقابل فراموش بھی۔ ہندوپاک میں تو اکثر شعراء کا اپنا ادبی حلقہ ہوتا ہے اور اساتذہ کے ذریعے انہیں اپنی زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ مگر غیر ملک میں جہاں شمع اردو کی ایک کرن بھی نہیں پہنچی ہے جہاں صرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو' وہاں چراغ اردو ادب کو روشن کرنا اور جلائے رکھنا ایک ناممکن سی بات ہے۔ مگر یہ سب رضا صاحب کی خدمات کا نتیجہ ہے کہ آج یہاں اردو ادب کے شائقین نظر آتے ہیں اور ہر طرف اردو کے چراغ فروزاں ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ افریقہ میں رضا صاحب کی حیثیت میر کارواں کی سی ہے۔

ایک روز بزم سخن کے سکریٹری مومن علی حیدری کسمو تشریف لائے' بزم ادب کسمو (جو میرے چند دوستوں نے مل کر بنائی ہے) کی طرف سے ان کے اعزاز میں مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ مشاعرہ کے بعد شعروادب پر گفتگو ہونے لگی۔ باتوں باتوں میں انہوں نے رضا صاحب کا ذکر بھی چھیڑا۔ میں ادھر ان کی باتیں بھی سن رہا تھا اور ادھر دل رضا صاحب سے ملاقات کے لیے بیتاب ہوا جا رہا تھا۔ ایک مدت سے یوں بھی خواہش تھی۔ مگر تب فاصلہ زیادہ تھا اور اب کچھ کم ہو رہا تھا۔ مومن علی حیدری صاحب سے بھی اچھی جان پہچان ہوگئی تھی۔ ان کی وساطت سے رضا صاحب سے ملاقات کی امید بھی قوی تر ہوگئی تھی۔

ایک دفعہ وائس آف کینیا کے ہندوستانی سکشن کے ڈائرکٹر کسمو آئے۔ ایک ریڈیائی مشاعرے کے لیے "طرح مصرع" دے گئے۔ اس طرح میں لگ بھگ سو شعر میں نے کہے تھے جو کسمو کے مختلف دوستوں میں شعراء کی تعداد بڑھانے کے لیے تقسیم کرنے تھے کیونکہ کسمو میں خود کہنے والے صرف دو ہی تھے۔ ایک ناچیز اور دوسرے چودھری محمد یوسف' مگر اب مشکل یہ تھی کہ ان اشعار پر اصلاح کس سے کرائی جائے کیونکہ اس وقت تو کیا مجھے اب بھی اپنے قلم پر بھروسہ نہیں ہے۔ میں

نے حیدری صاحب سے عرض کی کہ آپ ان غزلوں پر نظر ثانی کردیں۔ مشاعرے کے لیے دن بہت کم تھے۔ غزلیں بمبئی سے اصلاح ہو کر واپس وقت ملنی مشکل تھیں۔ حیدری صاحب نے کہا یہ کام میرا نہیں۔ رضا صاحب کا ہے اور وہ غزلیں اپنے ساتھ نیروبی لے گئے۔ رضا صاحب کی اصلاح کردہ غزلیں دیکھ کر میرے دل میں ان کے لیے اور بھی عقیدت پیدا ہوگئی۔ ان سے ملنے کا شوق اور بھی بڑھ گیا۔

حلقہ گفتوش نیروبی کے زیر اہتمام ہر سال نیروبی میں اقبال ڈے پر مشاعرے ہوتے رہے ہیں۔ 1962ء کے اقبال ڈے پر جس کے صدر پاکستانی ہائی کمشنر تھے۔ حیدری صاحب نے کسمو کے شعراء کو بھی مدعو کیا تھا۔ اور اسی مشاعرے میں میری پہلی ملاقات کالی داس گپتا رضا صاحب سے ہوئی حیدری صاحب نے رضا صاحب کی شخصیت کے متعلق جو کچھ فرمایا تھا میں نے اسے حرف بہ حرف صحیح پایا۔ رضا صاحب نہایت شریف النفس وسیع القلب خوش اخلاق اور بامروت وثروت انسان ہیں۔ ملنسار تو ہیں ہی، مجھ سے بھی بڑے تپاک سے ملے۔

سرزمین پنجاب نے اردو ادب کو بڑے بڑے مشاہیر عطا کیے ہیں۔ علامہ اقبال، جوش ملسیانی، تلوک چند محروم، حفیظ جالندھری، جگن ناتھ آزاد، ساحر لدھیانوی، فیض احمد فیض اور بہت سے دوسرے۔ اسی زمین کی اس وقت کی ایک گمنام سی ہستی رضا صاحب کی بھی ہے۔ جو (فضیلہ) علم وفن اور نور خیالات سے بہ کمال خاموشی مشرقی افریقہ میں شمع اردو کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ چالیس سال کی عمر ہی میں ان کا کلام بغیر کسی جھجک کے اعلیٰ شاعری کی کسی بھی محفل میں پیش کیا جاسکتا تھا۔ پندرہ سال کی عمر ہی میں وہ شعر کہنے لگے تھے۔ ابتداء میں انہوں نے حضرت کمال کرتار پوری سے مشورہ سخن کیا۔ اور پھر ان ہی کے مشورے سے قبلہ جوش ملسیانی کے تلامذہ میں شامل ہوئے۔ کمال صاحب خود بھی حضرت جوش ملسیانی کے فارغ الاصلاح تلامذہ میں ہیں اور بڑے نغز گو شاعر ہیں۔

شاعر ذاتی طور پر تعارف کا محتاج ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کی شاعری رسالوں وغیرہ کی موجودگی میں عام طور پر کسی تعارف کا محتاج نہیں رہتی مگر وطن سے ہزاروں

میل کے فاصلے پر رہنے کی وجہ سے رضا صاحب کو اپنی ذات اور ان کی شاعری دونوں کو منظرعام پر لانے کا موقع نہیں مل سکا ان کی اپنی طبع بھی نام ونمود کی خواہش سے کافی گھبراتی ہے۔ وہ بیس سال سے بھی کم عمر میں افریقہ چلے آئے یہی وجہ ہے کہ میں نے حتی الوسع انہیں اپنے ہندوستانی شعراء سے متعارف کرانا اپنا فرض سمجھا۔

اس وقت برعظیم ہندوپاک میں بھی فن شعروسخن کو جاننے والے خال خال ہی نظر آئیں گے۔ رضا صاحب بساط شعروسخن کی پٹی ہوئی (زد) نہیں۔ بلکہ کامل کھلاڑی ہیں۔ آجکل نام نہاد جدید شعراء نے (چند ایک کے سوا) ایسا طوفان بدتمیزی اٹھا رکھا ہے کہ شاعری گڈے گڑیا کا کھیل ہو کر رہ گئی ہے۔ عجز طبیعت کی وجہ سے مصرع کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا' نااہلیت کے سبب عروض سے لاپروائی برتنا چند ایک ایسی کمزوریاں ہیں جن پر وہ ناز کرتے ہیں۔ اور اساتذہ کی پگڑی تک اچھالنے سے باز نہیں آتے۔ رضا صاحب نے یہ رباعی شاید انہی کے لیے فرمائی ہوگی۔

ہر نظم کو شاعری پہ دھبا کہیے ##ہر شعر کو خامیوں کا ابا کہیے
اک نظم میں سو بحریں اکھٹی ہوں اگر ##کیوں اس کو نہ چوں چوں کا مربا کہیے

رضا صاحب نے فن کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کی زبان متروکات سے پاک اور ٹکسالی ہوتی ہے اور ان کا طرز بیان لفظوں کا انتخاب' تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال حسین اور جامع ہے جو نام نہاد جدید شعراء کی دسترس سے قطعی باہر ہے۔ آپ ان کا کلام دیکھ کر ضرور کہہ اٹھیں گے کہ ان کا یہ مقطع غلط بیانی پر مبنی نہیں ہے۔

رضا فیض استاد ہے تجھ پر ایسا
فصاحت تیرے آگے بھرتی ہے پانی

آپ نے سستی شہرت اور نام ونمود سے بے نیاز ہو کر خلوص وحقیقت سے ہم آہنگی پیدا کی ہے زندگی اور ادب کی قدروں کو شعروفن کے صحیح سانچوں میں ڈھالا ہے۔ جدید خیالات کے ساتھ ساتھ قدیم روایاتی شان اور دلکشی کو بھی برقرار رکھا ہے۔ جدید رجحانات اور نئی قدروں کو اپنایا ہے۔ ان کے یہاں قدیم وجدید کا جو

حسین امتزاج ملتا ہے وہ قابل تحسین ہے۔

رضا صاحب نے شاعری کی تقریباً" ہر صنف میں طبع آزمائی فرمائی ہے اور ہر صنف میں امتیاز حاصل کیا ہے غزل' نظم' رباعی' قطعہ' گیت غرض کہ جب بھی وہ قلم کو جنبش دیتے ہیں تو فکر وبیان کی بلندیوں کو چھولیتے ہیں۔ ان کے گلشن کا کوئی پھول نہ خوشبو سے بے بہرہ ہے اور نہ وہ مرجھایا ہوا ہے' نہ داغدار' نہ بے رنگ۔

غزل شاعری کی جان ہے اس میں نئے نئے خیالات کو اچھوتے انداز میں اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے کہ وہ تیر ونشتر کی طرح دل میں اترتے چلے جاتے ہیں واردات قلب شدت جذبات کا بیان' غزل کی وہ امتیازی خصوصیات ہیں جو اس کو دیگر اصناف سخن سے جدا کرتے ہیں اور اگر طرز بیان چست ہو تو ایک معمولی سا مضمون بھی اثر چھوڑے بغیر نہیں رہتا۔ مثلاً" رضا کا یہی شعر دیکھئے۔

وہاں بجلیاں رقص کرتی ملیں گی ##یہی ہے میرے آشیاں کی نشانی

اس شعر میں کوئی نیا پن یا اچھوتا خیال پیش نہیں کیا گیا۔ اس خیال کا اظہار اکثر شعراء نے کیا ہے مگر اس کے طرز بیان میں جو حسن ہے وہ شعر پڑھتے ہی شراب کی مستی کی طرح دل ودماغ پہ چھا جاتا ہے۔ ایک دفعہ میں نے آپ سے جگر مراد آبادی کی مشہور غزل "ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھاکے پی گیا۔" کی زمین میں کچھ اشعار کی فرمائش کی آپ نے جو اس وقت پامال زمین میں پھول کھلائے ہیں ان کی بہار سے آپ بھی لطف اندوز ہوں۔

تائب کو دیکھو' دیکھ کر ابر سیاہ کو
توبہ کے حال بد پہ ترس کھا کے پی گیا

دوزخ' بہشت' موت' حیات' اہل شرع وپند
میکش نظام دہر سے گھبرا کے پی گیا

ہوتی رہی ادھر مری بے ہوشیوں کی بات
اور اس طرف میں ہوش میں آ آ کے پی گیا

گزرا جو باغ دہر سے مینا بدست میں
پھولوں کی بو سے جام کو مہکا کے پی گیا

رضا صاحب نے اپنے کلام میں نئی نئی ترکیبیں بھی تراشی ہیں اور غرابت کا شائبہ تک نہیں۔ کلام بہت پاکیزہ ہے۔ کوئی شعر عامیانہ رنگ کا نظر نہیں آتا۔ جہاں تک ہوسکے وہ روز مرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ انہیں فارسیت اور بڑے بڑے الفاظ استعمال کرنے سے حتی الوسع گریز ہے' فرماتے ہیں۔

فارسیت ہی زبان ہے تو مجھے ناز نہیں
میری نظروں میں تکلف کبھی ممتاز نہیں
قابل فہم زباں ہو تو سخن کا ہے مزا
طوطی ہندوستاں' بلبل شیراز نہیں

گذشہ چند سالوں سے عمر کے ساتھ ساتھ رضا صاحب کی شاعری میں ایک انقلاب سا آگیا ہے۔ خیالات اور پختہ ہوگئے ہیں احساسات میں گہرائی آگئی ہے۔ حیات کی صحیح نقاشی اور تاثرات کی مکمل صورت ملنے لگی ہے۔ ندرت مضامین' پرواز تخیل اور حسین استعاروں کی دلفریبی دو چند ہوگئی ہے۔ آگہی' حق بینی اور فطرت شناسی کے نمونے جو انسانیت کے روشن پہلو ہیں۔ آپ کے ہاں بکثرت ملنے لگے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سراغ منزل ہستی کسی کو مل نہ سکا
ہمارے دیکھتے کتنے ہی کارواں گزرے

کہکشاں' چاند ستارے ہیں مرے نقش قدم
کون کہتا ہے فلک تک میری پرواز نہیں

جواں نظروں میں سب کچھ جاوداں ہے
یہ کس نے کہہ دیا فانی ہے دینا

یہ غلط ہے حسن ہے آتش فشاں

عشق خود ہی شعلہ خاموش ہے

ہم وہ نہیں جو بھاگ کے ساحل کی لیں پناہ
موجوں کے ساتھ ساتھ لڑیں گے بھنور سے ہم

وفا کی راہ میں گل گشت ہی نہیں کافی
ملیں جو خار بھی ان کا بھی احترام کریں

طوفان کو ساحل کی خموشی پر رشک
ساحل کی تمنا کہ وہ طوفان ہوتا

تم نہ مانے میری وفاؤں کو
دہریے تک خدا کو مان گئے

طوفاں سے کہو سرمری کشتی سے نہ ٹکے
دریاؤں کا پالا ہوں میرے پاس نہ پھٹکے

مجھ کو خوابیدہ دیکھ کر قسمت
پاس ہی سے، گزر گئی ہو گی

ہر ایک اشک نے پلکوں پہ آکے یہ جانا
گہر بھی خاک میں اکثر ملائے جاتے ہیں

بندگی کے لیے تیار ہو دل بھی ورنہ
رات بھر جاگتے رہنے میں بھی کیا ملتا ہے

ناکام محبت کے آنسو ہوتے ہیں نہایت پاکیزہ
جو پانی ان آنکھوں سے بہا وہ گنگ و جمن میں کیا ہوگا

ادھر دور نمو رکھا ادھر فصل خزاں رکھ دی
بشر کی ناتواں ہستی پھر ان کے درمیاں رکھ دی

جب بے سرو ساماں تھا تو شہروں کی طلب تھی
اب باسر وساماں ہوں تو صحرا کی طلب ہے

جنہیں غرور ہے دولت کا جاہ و حشمت کا
ہم ایسے لوگوں کو خاطر میں لا نہیں سکتے

رضا وہ یاس کے کانٹے ہوں یا امید کے پھول
ہم اپنے سینے سے سب کو لگائے جاتے ہیں

اب رضا صاحب کی غزلوں کے چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں دقیق مطالب اتنی سلیس زبان میں بیان کیے گئے ہیں کہ ان پر کسی استاد کے شعروں کا گمان ہوتا ہے۔ اس حالت میں جب کہ چالیس سال کی عمر کے پچھلے بیس سال انہوں نے ہندوستان سے باہر گزارے ہوں۔ سلاست زبان کا یہ اکتساب اور بھی حیرت افروز ہے۔ چھوٹی بحروں کی غزل سے تین تین اشعار اس لیے پیش کیے گئے ہیں تاکہ آپ کو ان کی سلیس اور ٹکسالی زبان کے صحیح رجحانات کا اندازہ ہو سکے۔

مرے مرنے جینے کی کیا پوچھتے ہو
ابھی باخبر تھا ابھی بے خبر ہوں

بشر ہونا اپنا نہیں بھولتے تم
مگر بھول جاتے ہو میں بھی بشر ہوں

رضا مجھ کو بے کار کیوں جانتے ہو
فقط خوب ہی میں نہیں خوب تر ہوں

○

مجھ سے قیمت نہ مانگ اے ساقی
تنگ دستی کی انتہا ہوں میں

آپ جو کچھ مجھے سمجھتے ہیں!

اس حقیقت کو جانتا ہوں میں
ان کی نظریں تو ان کی نظریں ہیں
اپنی نظروں سے گر گیا ہوں میں

○

سی لیے ہونٹ پی لیے آنسو
ضبط الفت کے پاس نے مارا
آنسوؤں سے بھی یہ نہیں بجھتی
ہم کو آنکھوں کی پیاس نے مارا
اس سے دیوانگی ہی بہتر تھی
ہم کو ہوش وحواس نے مارا

○

رضا صاحب ہرچند اپنے وطن سے دور فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مگر وطن کی دوری یہاں ان کے دل کو تڑپا رہی ہے۔ وہ اپنے ایک شعر میں اپنی غریب الوطنی کا شکوہ یوں کر رہے ہیں۔

بہشت میں گو نہ تھا کوئی غم تھا چار سو اک نشاط پیہم
مگر رضا کا نکل گیا دم وہاں جو اپنا وطن نہ پایا

رضا صاحب نے جس طرح بادہ تغزل کے ساغر رنگین چھلکائے ہیں کہ ان میں ابہام ہے نہ نعرہ بازی۔ انہوں نے جدید شاعری کی دھن میں فن وبیان سخن کبھی ہاتھ جانے نہ دیا۔ وہ صرف اس حد تک جدید ہیں جس حد تک عصر حاضر۔ کے ہر باشعور اور باذوق شاعر کو ہونا چاہیے۔ رضا کی نظموں میں صرف حقیقت ہی حقیقت جھلکتی ہے۔ ان کے موضوعات میں تنوع ہے۔ انہوں نے اپنی ذات کو ابھارنے کی غیر شاعرانہ اور خود غرضانہ حرکت کبھی نہیں کی۔ ان کی نظموں میں معاشی ناہمواریوں کے گلے ہیں۔ معاشرتی زیادتیوں سے بیزاری ہے اور انسانیت کی غیر منصفانہ صورتوں کے

خلاف احتجاج ہے۔ وطن کی محبت کے نغمے ہیں۔ باہمی اخوت ہے۔ اور حسن فطرت کی تعریف ہے۔ ان کی ایک نظم "ہماری دوستی" کے دو بند دیکھئے اور بے غرضانہ دوستی کا خیر مقدم کیجئے۔

حیران نہ ہوں آپ کہ ہم دوست ہیں پھر بھی
گو نام میرا ہندو ہے اور اس کا مسلمان

حیران نہ ہو آپ کہ لڑتے ہی نہیں ہم
گو اس کا ہے معبود خدا میرا ہے بھگوان

حیران نہ ہو آپ کہ ہم کیوں ہیں برابر
گو مذہبا" اک سی نہیں ہم دونوں کی میزان

○

جس دور کی آغوش میں ہم دوست بنے تھے
مذہب کے محافظ ابھی پیدا نہ ہوئے تھے

○

اس وقت سے ہم دوست ہیں جب صلح تھی ہر سمت
انسان کا انسان سے جھگڑا نہ ہوا تھا

اخلاق ومساوات ہی تھے لعل وجواہر
دنیا کو زرومال پہ غرہ نہ ہوا تھا

ہر شخص کی تھی ظاہر وباطن میں صفائی
کھوٹے پہ کھرے ہونے کا دھوکہ نہ ہوا تھا

○

ہم دوست فقط دوست ہیں دنیا ہیں نہ دیں ہم
اس دور کے انسان' ریا کار نہیں ہم

○

ایک نظم "کوئی نہ آئے میرے منتشر خیالوں میں" کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

مجھے خیال کی دنیا اجاڑ لینے دو
گڑی ہیں دل میں جو پھانسیں اکھاڑ لینے دو
حسیں امید کے پردوں کو پھاڑ لینے دو
کوئی دم اور مجھے غم کی آڑ لینے دو
کوئی نہ آئے میرے منتشر خیالوں میں

نظم "کالی رات" کا ایک بند ملاحظہ کیجئے۔

غم زدوں کے لیے ساتھی نہیں بڑھ کر تجھ سے
لمبی ہونے پہ ترے کرتے ہیں وہ کتنا ناز
رہزنوں، فتنہ گروں، یاس کے ماروں کے لیے
تو کسی شوخ حسینہ کی ہے اک زلف دراز

○

آسام میں 1950ء میں جو بھونچال آیا تھا۔ اس کی منظر کشی انہوں نے کس دردناک اور دل دہلا دینے والے انداز میں کی ہے۔

یوں مہیب آواز اٹھیں دہر کو دہلا گئیں
بدلیاں ساون کی جھومیں آگ سی برسا گئیں
ندیاں پھٹ کر جو پھیلیں کل زمیں پر چھا گئیں
مچھلیاں بدبو کے مارے ساحلوں پر آ گئیں
قطرہ قطرہ زہر کر ڈالا فنا کے جام نے

○

اشک جو ٹپکے وہ گرتے گرتے دریا ہوگئے
جسم دب کر خاک میں آزاد دنیا ہوگئے
وہ مکاں جو آسرا تھے آج دھوکا ہوگئے

آنکھ جھپکی تھی وہ سب ساماں مہیا ہوگئے
جو چھپا رکھے تھے اس روز خراب انجام نے

○

"ہند کا سپاہی" میں سپاہی کا دل اس طرح ابھارتے ہیں جیسے میدان جنگ میں اس کے شانہ بشانہ لڑ رہے ہوں۔

جس کی تعظیم میں سر جھکتے ہیں وہ سر ہے تو
جس کی قیمت نہیں لگ سکتی وہ گوہر ہے تو
خود غرض جو نہیں وہ قوم کا نوکر ہے تو
دشمنوں کو جو نگلتا ہے وہ اژدر ہے تو
اسپ ہمت کو تو ہی ایڑ لگا سکتا ہے
تو ہی افواج مخالف کو بھگا سکتا ہے

○

قوم کے داغ ذلالت کو مٹانے والے
کھل گئے ہیں تیری کنجی سے جفا کے تالے
سینہ رہ پہ تری گرم روی کے چھالے
تو نے کیا کیا نہ عدو رن میں بھسم کر ڈالے
جیت کر آتا ہے جب ایسا سماں ہوتا ہے
تری صورت پہ فرشتے کا گماں ہوتا ہے

○

ان کی دوسری نظمیں بھی آج ہمارے ادب کا گراں قدر حصہ ہیں۔ محنت کشوں سے، نوجوان سے، تنہائی، مہارانی لکشمی بائی، بارش، ماں وغیرہ یہ نظمیں حقیقت پسندی اور واقعات نگاری کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کی ایک نظم "رکشہ والے سے" کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔

تجھے میں جانوں گا اس وقت جب تری ہمت
ہر اک رعونت و بیداد کو کچل دے گی
کرے گی اونچا زمانے میں پرچم انصاف
ستم گری کے ہر آئین کو بدل دے گی

چونکہ آپ کو مبسوط اور طوفانی نظمیں لکھنے کا موقع اور فرصت بہت ہی کم ملتی ہے لہٰذا بعض اوقات وہ ان سے دور بھاگنے کی کوشش میں رباعیات اور قطعات کا سہارا لیتے ہیں۔ رباعی کے اوزان مخصوص ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ فن عام لوگوں اور شاعروں کی سمجھ میں نہیں آتا بعض لوگ قطعات کو لاعلمی سے ردیف اور قافیہ کو مصرعہ اول، ثانی اور چہارم میں مساوی رکھ کر اسے رباعی کہتے ہیں۔ یہ درست نہیں ہے۔ رباعی قطعات کے اوزان میں نہیں کہی جا سکتی۔ رضا صاحب کی چند رباعیاں ملاحظہ کیجئے۔

ہر وقت غم قوم مٹاتے رہنا
ہر حال میں کام آسکے آتے رہنا
تم بحر شجاعت کے شناور ہو رضا
طوفاں میں بھی کشتی کو چلاتے رہنا

○

ڈرنا نہ خدا سے آدمی سے ڈرنا
پرہیز اپنوں سے غیر کا دم بھرنا
واقف ہوں ترے ضمیر سے اے دل
خو ہے تری انسانوں کو رسوا کرنا

○

باتیں اک دوسرے کی سہنا سیکھو
دریا میں برنگ موج بہنا سیکھو
بے سود ہیں یہ دیر وحرم کے جھگڑے

مل جل کر بھائیوں سے رہنا سیکھو

○

قطعات سے لطف اندوزی حاصل کیجئے۔

عیش، آرام، خوشی، کھیل تماشا دنیا
فکر کا، رنج کا اندوہ کا سایہ دنیا
باوجود اتنی دورنگی کے بھی حیران ہوں میں
کس بنا پر لب انسان پہ ہے دنیا دنیا

○

دل آرا، دلربا، دلبر،
خوشی وآشتی ہی اس کا پیغام
دوام اہل فنا کو بخشتی ہے
ہے اس پر بھی محبت کتنی بدنام

رضا کا قلم ایک بانسری ہے جس سے میٹھے میٹھے سروں میں رسیلی گیت نما نظمیں پھوٹتیں ہیں۔

بے برسے گزرا ہے ساون
پیاسا جنگل پیاسا گلشن
بھردے ان کا خالی دامن
اے تاروں کی آنکھ کے کاجل
اے کالے منڈلاتے بادل
سوکھے ہونٹ ہنسی مرجھائی
سوکھا پھول کلی مرجھائی
ہر اک شاخ ہری مرجھائی
کھل کے برس اک کردے جھل تھل

اے کالے منڈلاتے بادل
بڑھ کر پیچھے ہٹتا جائے
گھن گرجن کے بم برسائے
دور ہی سے کیوں ہم کو ڈرائے
اے بازیگر، نٹ کھٹ چنچل
اے کالے منڈلاتے بادل

ان کا ایک اور گیت ملاحظہ فرمایئے۔

پھر سے سویا پیار جگا دو
من ساگر میں پھینک کے کنکر
اک طوفان اٹھا دو.....
جاگے پیار تو دنیا جاگے
سورج نکلے اندھیرا بھاگے
بہہ جائے خوشیوں کی ندیا
وہ سنگیت بہا دو
پھر سے سویا.....
تم ہی تو ہو پریمی کی آشا
مکھ سے کرو پھولوں کی برکھا
دھیان میں پریمی کے آکر تم
پریم کے پھول کھلا دو
پھر سے سویا.....
تم وایو ہو شیتل شیتل
آئی ہو پی کر گنگا جل
سب کے من کی چنچلتا کو
پیار سے شیت بنا دو

پھر سے سویا.....

آپ کا قلم نعت اور سلام میں بھی کم معجز نما نہیں ہے۔ چونکہ مضمون طویل ہوگیا ہے اس لیے ایک ہی نعت کے دو بندوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

فرش پر سلطنت عرش کے والی آئے
لے کے مالک سے دل و ہمت عالی آئے

مظہر وجلوہ گر شان جلالی آئے
یہ خبر عام ہوئی باغ کے مالی آئے

چمن دہر کی ہر شاخ ثمر دار ہوئی
ہر کلی پھول بنی پھول سے گلزار ہوئی

○

اے رسولؐ آپ کو اللہ کی رحمت کی قسم
دل معصوم کی میراث رسالت کی قسم

عشق اللہ کی قسم اور رنگ نبوت کی قسم
نور دیں، نور ہدیٰ نور طہارت کی قسم

زیست کے راز کو انسان پر افشا کردیں
ہر نظر کو حق و باطل سے شناسا کردیں

مجھے امید ہے کہ اس مضمون کو پڑھ کر جو رضا صاحب کی ہمہ صفت ذات اور شاعری کے کسی پہلو کو بھی اجاگر کرنے میں کامیاب نہیں، اردو نوازان کا مزید کلام پڑھنے کے خواہش مند ہوں گے۔ اگر ایسا ہوا تو میں اپنی محنت کو اکارت نہیں سمجھوں گا اور ہندوستان میں اردو طبقہ کی ہردلعزیزی کی داد دوں گا۔

نعت گوئی

سرور کائنات سرکار دوعالم تاجدار انبیاء کی تحسین وتوصیف میں آج تک ہزاروں کی تعداد میں نعتیں کہی گئی ہیں۔ مسلم شعراء کے ساتھ ساتھ سینکڑوں غیر مسلم شعراء نے حضورؐ کی خدمت اقدس میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان غیر مسلم شعراء میں ایک نام کالی داس گپتا رضا کا بھی ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری میں وہ سب کچھ ہے۔ جو ایک نعت گو شاعر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ سرکار دوعالم کی محبت کا ذکر، رحمت دو عالمؐ کے معجزات اور اسوہ حسنہ کے موضوعات کالی داس گپتا رضا کی نعتوں میں مہ وانجم کی طرح تاباں ہیں۔ نعت کہنے کے لیے جس اعجاز بیان کی، جن مقدس الفاظ کی، اور جس اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ان کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔ غیر مسلم ہوتے ہوئے بھی انہوں نے جو نذرانہ عقیدت حضورؐ کی خدمت اقدس میں پیش کیا ہے۔ قابل داد وتحسین ہے۔ "اجالے" کے نام سے نذرانہ عقیدت پیش کرکے کالی داس گپتا رضا، نے حضورؐ کے نام لیواؤں، عاشق رسول، اور مدح سراؤں میں اپنا نام لکھ کر اپنی بخشش کا اہتمام کیا ہے۔ رسولؐ اللہ چونکہ رحمت العالمین کے روپ میں اس دنیا میں جلوہ گر ہوئے لہٰذا رضا کے لیے ان کی شفاعت اور بخشش کا میدان صاف ہوگیا ہے۔

سچ پوچھئے تو کائنات نعت وحمد میں جو شاعر شعلہ بجاں نہ ہو، اس کا نغمہ بلب ہوجانا آسان نہیں۔ رضا نے بحیثیت نعت گو شاعر پورا حق ادا کردیا ہے۔ آیئے ہم نازونیاز کی اس شاعرانہ فضا پر بھی ایک نظرڈالیں۔ جذب دروں اور تغزل کا بانکپن ہر مصرع میں دامن کش قلب ونظر ہے۔ آپ کو ان اشعار میں حسن آرزو گداز التجا

اور سوز تمنا کی ایک صاف وشفاف چاندنی نظر آئے گی۔ یوں معلوم ہوتا ہے رضا نے اپنی فکر اور اسلوب کو لازوال حسن عطا کیا ہے۔

جناب نور احمد میرٹھی کی مرتبہ ضخیم کتاب "بہرزباں بہرزماں" جو غیر مسلم نعت گو شعراء کے علمی تذکرہ اور نعتیہ کلام پر مشتمل ہے۔ 1994ء میں کراچی سے چھپی تھی۔ یہ مبارک کتاب ان غیر مسلم نعت گو شعراء کے حالات اور نعتوں پر مبنی ہے جنہوں نے حضورؐ کی خدمت اقدس میں دل وجان سے نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس میں گپتا رضا کو بحیثیت نعت گو نمایاں کرکے چھاپا گیا ہے۔ کل آٹھ صفحوں پر ان کا کلام آیا ہے۔ جن میں رضا صاحب کے نعتیہ مجموعے "اجالے" کی رنگین تصویر بھی شامل ہے۔ کل منتخب اشعار 42 ہیں۔

رحمت العالمین کا دامن بہت کشادہ ہے۔ اسے جس نے بھی پکڑا پار اتر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک ایسا نور ہے جس سے ساری نوع انسانی جگمگا اٹھی ہے۔ یہاں یہ کہنا خلاف حقیقت نہیں ہوگا کہ حضرت رسول خداؐ چونکہ سارے عالم بشری کے لیے مامور ہوئے تھے۔ اس لیے آپ کی عقیدت ومحبت اور تعظیم وتوقیر تمام بنی نوع انسان پر واجب ہے۔ رضا صاحب نے یہ نعتیں محض خانہ پری کے لیے نہیں کہی ہیں۔ ان میں وہ عقیدت جھلکتی ہے جس کی توقع ایک سچے مسلمان سے کی جاسکتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

جام اچھے ہیں' خم اچھے ہیں' صراحی اچھی ساقی ے خانہ احمد کی ہے کتنی اچھی

عشق میں آپ کے آئے تو بلا بھی اچھی واسطے آپ کے جھیلوں تو ستم بھی اچھا

رضا صاحب ہندو ہیں۔ مگر ہم مذہبیت کے قائل نہیں ہیں۔ ہمارے سامنے گپتا رضا کی شخصیت ہے جنہوں نے مقدور سے نیک فطرت اور بے ریا شخصیت پائی ہے۔ فصاحت وبلاغت تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ ذوق اظہار کی اسی فراوانی' شیوا بیانی سے نعت گو شعراء میں انہوں نے اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔ "اجالے" کا متن اس رباعی سے شروع ہوتا ہے۔

بے کار کی باتوں نے ابھارا ہم کو

تقسیم مذاہب سے نہیں کچھ بگڑا
انسان کی تقسیم نے مارا ہم کو

"اجالے" رضا صاحب کی ان اسلامی اشعار پر مشتمل ہے جو انہوں نے نیروبی' کینیا' مشرقی افریقہ کے قیام کے دوران میں کہے تھے۔ دیباچے کے آخر میں بڑے والہانہ انداز میں لکھتے ہیں' "تمنا ہے میرا یہ حقیر سا مجموعہ جس پر میرا دل وجان نثار ہے۔ قاری کے لیے باعث تسکین دل وجاں ہو....."

رضا صاحب جب بھی کسی نعتیہ محفل میں نعت پڑھتے ہیں' تو پہلے ذیل کی رباعی اپنے مخصوص انداز میں پڑھا کرتے ہیں۔

جو شعر کہا لب طہارت سے کہا — جی جان سے احترام و عزت سے کہا
ہے قابل درگزر غلط بھی میرا — جو کچھ بھی کہا میں نے محبت سے کہا

ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے رسول کریمؐ کی شان وعقیدت میں جو کچھ کہا ہے وہ نہایت احترام سے کہا ہے۔ اگر اس بات کا احتمال ہے کہ اس میں ان کے قلم سے کچھ ایسا نکل گیا جو حضورؐ کے احترام کے لیے ناکافی ہو۔ ان کی درخواست ہے کہ اگر ایسا بھی ہے تو یہ سمجھ کر نظرانداز کر دیجئے کہ ان کا مفہوم بہرحال حب رسولؐ میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ خود ملاحظہ فرمایئے۔

دیکھا ہے بارہا رضا یہ دل کی آنکھ سے — نور رسولؐ نور خدا سے جدا نہیں

رباعی:

ہر طور سے راز کو کھولا ہم نے — سو پلڑوں میں اک بات کو تولا ہم نے
تحریر وہیں پائیں محمد کی صفات — جس گوشہ دِل کو بھی ٹٹولا ہم نے

قطعہ:

شعر کہتا ہے وہ شہرت کا طلبگار نہیں — درم ودرم کا دولت کا طلبگار نہیں
اے نبی! تیری شفاعت تیری رحمت کے سوا — تیرا شاعر کسی نعمت کا طلبگار نہیں

○

بزم احمد سے بے گانہ رہوں ناممکن
سب ہوں دیوانے میں فرزانہ رہوں ناممکن

خزینہ آپ ہیں صد شادی وتلطف کا　　سفینہ آپ ہیں دریائے سرمدی کے لیے

○

عرش سے لائے پیمبر وہ پیام زندگی　　بڑھ گیا جس سے وقار واحترام زندگی
آپ کی باتوں پہ قرباں آپ کے دم پر نثار　　کر دیا مایوس دل کو ہم کلام زندگی

○

بے قراروں کو ہے تیرا آسرا بعد خدا　　روح دل تو ہی تو ہے تسکین جاں تو ہی تو ہے

○

رضا صاحب مشہور استاد پنڈت جوش ملسیانی تلمیذ' جہاں استاد داغ دہلوی کے شاگرد ہیں۔ جوش اسکول کی روایت رہی ہے کہ ان کے شاگرد جو بیشتر ہندو تھے' اسلامی اشعار بھی ضرور کہتے تھے۔ اور بڑے سلیقے سے کہتے تھے۔ چنانچہ رضا صاحب نے ایک مضمون "دبستان جوش ملسیانی میں نعت گوئی" بھی لکھا تھا جو بہت پسند کیا گیا تھا۔ جناب جوش ملسیانی کے ایک شاگرد ٹھاکر رتن سنگھ کلیم تھے۔ ان کا ایک نعتیہ شعر بہت مشہور ہے۔ میں یہ شعر رضا صاحب کی زبانی بار بار سن چکا ہوں۔ کلیم فرماتے ہیں۔

عقل ادب سرشت کو کچھ سوجھتا نہیں　　اے عشق! تو بتا میں محمدؐ کو کیا کہوں

رضا صاحب کے یہاں بھی ایسے بے ساختہ اشعار کی کمی نہیں۔ 25 اگست 1994ء کو بمبئی میں ایک نعتیہ مشاعرہ ہوا تھا۔ صدارت خود گپتا رضا صاحب کی تھی۔ اس میں انہوں نے جو کلام پڑھا وہ نذر احباب کیا جاتا ہے۔

قطعات:

یوں گلے ملنے کے اعلان سے کیا ہوتا ہے　　دیکھنا یہ ہے کہ باطن میں کہیں کد تو نہیں
نعت کہتا ہوں تو یہ سوچتا ہوں میں پہلے　　دل وجاں میں کہیں انکار محمد تو نہیں

قافلے بھر کے پیاموں کے میں لے آؤں تو کیا
سنئے! کیا کہتے ہوئے بانگ درا آتی ہے
یہ پڑا دھن نہیں ٹھوکر لگے ہاتھ آجائے
یہ رسالت ہے' یہ با حکم خدا آتی ہے

نعتیہ غزل:

بزم احمدؐ کو جو چھو کر بھی ضیا آتی ہے
شب دیجور میں سو شمعیں جلا آتی ہے

نہ نماز آتی ہے مجھ کو نہ دعا آتی ہے
میرے ہونٹوں سے مگر حق کی صدا آتی ہے

بزم میلاد کا یہ کم تو چمنکار نہیں
کہ یہاں کم سہی آواز رضا آتی ہے

زخم دل کھولے ہی رکھنا کہ اسی کھڑکی سے
دست یثرب کی وہ مستانی ہوئی آتی ہے

کیسے میلاد پہ برسیں نہ خوشی کے آنسو
یہ دن آتا ہے تو رحمت کی گھٹا آتی ہے

آپؐ کا آنا تھا اس شمع کا جلنا جس سے
روشنی نیر تاباں سے سوا آتی ہے

ہم کو جنت کی رتوں کی نہیں پروا کہ ادھر
ابر' مکہ سے' مدینے سے صبا آتی ہے

کیوں رضا بزم میں آئے اسے کیا آتا ہے
شاعری آتی ہے شاید' وہ بھی کیا آتی ہے

○

افریقہ میں قیام کے دوران رضا صاحب نے جو بھی نعتیہ کلام پیش کیا۔ اس میں سے کچھ نعتیں ان کے مجموعے کلام "اجالے" کی زینت ہیں۔ ان کا بیشتر نعتیہ کلام افریقہ کو خیرباد کرتے وقت ضائع ہوگیا۔ میرے اس مختصر مضمون سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کے دل میں رسالت مآب سے کس قدر گہری عقیدت و محبت تھی۔ ان کے ہر سخن سے لہجے کی تازگی اور زبان وبیان کی سادگی وروانی کے قلبی محسوسات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان کا ہر شعر زبان وبیان کی صفائی' متانت وشائستگی۔ شیرینی وگھلاوٹ اور لطیف احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

بحیثیت رباعی گو

تاریخ ادب کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صنف رباعی اہل عجم کی ایجاد ہے اور سب سے پہلے ایران کے مشہور و معروف شاعر رودکی کو رباعی کہنے کا شرف حاصل ہوا۔ اردو زبان میں جن شعراء نے صنف رباعی میں طبع آزمائی فرمائی ہے اس سے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ شعرائے اردو نے شعرائے فارسی کی پیروی کی ہے۔ فارسی کے مشہور رباعی گویوں میں عمر خیام' سرمد' بابا افضل کاشانی وغیرہ کی رباعیاں رباعی گوئی کا اعلیٰ معیار قائم کرتی ہیں اور عام شاعرانہ آواز سے بلند ہوکر کہی گئی ہیں۔ رباعی کے میدان میں ان شعراء کو جو کامیابی اور شہرت نصیب ہوئی وہ اور کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ صنف رباعی میں عمر خیام کو جو درجہ حاصل ہے' آج تک کوئی شاعر اس مقام تک رسائی نہ کرسکا۔ اس صنف میں عمر خیام کا ایک منفرد مقام ہے اور بلاشبہ وہ شہنشاہ رباعی ہیں۔

اردو زبان میں بھی چند اچھے رباعی گو شاعر ہیں جن میں جوش ملیح آبادی' فراق گورکھپوری' تلوک چند محروم' امجد حیدر آبادی اور یگانہ چنگیزی کے نام لیے جاسکتے ہیں' ان شعراء میں دیکھا جائے تو سب سے پیش پیش شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نظر آتے ہیں اور بعض وقت ان کی رباعیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا احساس ہوتا ہے کہ وہ خیال سے بہت قریب ہوکر گزرے ہیں' فراق گورکھپوری کے تغزل میں جو بات پائی جاتی ہے وہی رنگ ان کی رباعیوں میں بھی جھلکتا ہے۔ ان کی رباعیات میں جمالیاتی رنگ اس قدر ہے کہ وہ کسی اور کی رباعیوں میں نہیں پایا جاتا۔ ان رباعیات میں ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے یہ اتنی آسان اور عام فہم زبان

میں کہی ہیں کہ ایک معمولی شخص بھی ان کے مقصد و فہم کو سمجھ سکتا ہے۔ سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ زندگی کی وہ کیفیت بھی ملتی ہے جس کو حسن و عشق کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر یہی بات جوش ملیح آبادی کے کلام میں نہیں ملے گی۔ ان کی رباعیات کا نچوڑ حاصل کرنے کے لیے لغات سامنے رکھنے کی ضرورت رہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی رباعیوں میں فلسفیانہ افکار اور خودکلامی کی کیفیت کا بے باکانہ اظہار کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے فراق کی رباعیاں میری رائے میں سلیس زبان کے سبب عوام میں زیادہ مقبول ہو سکتی ہیں۔ یگانہ کی رباعیاں تیر و نشتر کی طرح ہوتی ہیں اور ان کی گہرائی بھی زیادہ ہے۔ تلوک چند محروم' امجد حیدر آبادی کی رباعیات میں حقائق و معارف کے بیانات' زمانے کی ستم ظریفیوں کے خلاف مضامین نہایت حسن و خوبی سے نظم کیے گئے ہیں' اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اردو شاعری میں بھی رباعی کی صنف کافی مقبول ہے اور چند شعراء کی رباعیات فارسی شعراء کے ہم پلہ قرار دی جا سکتی ہیں۔

ہر چند رباعی کا میدان بہت ہی محدود ہے۔ چار مصرعوں میں اہم سے اہم اور بلند سے بلند مفہوم نظم کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات وہ خیال جو غزل کے ایک شعر میں سمانا مشکل ہو جاتا ہے' رباعی کے دو شعروں میں آسانی کے ساتھ سما سکتا ہے۔ اسے ایک ننھی غزل کہنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ اس طرح رباعی کا دامن مختصر ہوتے ہوئے بھی وسیع ہے۔ سید محمد حسن بلگرامی نے رباعی کی اس وسعت کو خیابان عرفان کے دیباچے میں اس طرح واضح کیا ہے:

"چار مصرعوں کی بساط ہی کیا' لیکن اس مختصر اور تنگ چار دیواری کے اندر معارف و حقائق کی بستیاں نظر آتی ہیں اور اس چھوٹے سے چوکھٹے میں مصوری کے ایسے نادر مکمل نمونے جڑے جاتے ہیں کہ اہل نظر نقش بہ دیوار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ "---

اردو ادب میں رباعی کو ایک نہایت ہی مشکل صنف کہا گیا ہے اور اسی لیے بہت کم شعراء اس کی طرف راغب ہوتے ہیں اور اس کے پیچیدہ اور محدود اوزان

میں الجھنا پسند نہیں کرتے۔ شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی قطرہ و قلزم کے ابتدئیہ میں یہ فرماتے ہیں:

"رباعی ایک بہت بڑی بلا ہے اور نہایت جان لیوا صنف کلام ہے۔ یہ کم بخت چالیس برس سے بیشتر کسی بڑے سے بڑے شاعر کے بس میں آنے والی چیز نہیں۔ بات یہ ہے کہ جب تک کسی شاعر کو بے پناہ مشاقی اور دیدہ وری کی بدولت دریا کو کوزے میں بھر لینے کا فن نہیں آتا' اس وقت تک رباعی اس کے قابو میں نہیں آتی۔----"

میں جس شاعر کا ذکر رباعی گوئی کی حیثیت سے کرنے والا ہوں اس نے اپنی زندگی کا لگ بھگ ربع صدی حصہ مشرقی افریقہ کے صحراؤں میں پھول کھلاتے ہوئے گزارا ہے۔ اس مشہور و معروف شخصیت کا نام کالی داس گپتا رضا ہے۔ جس نے 25 اگست 1925ء کو مکند پور ضلع جالندھر کے مشہور اگروال خاندان میں آنکھیں کھولیں اور 1949ء میں مشرقی افریقہ کی دھرتی پر قدم رکھا۔ اپنی ادبی زندگی کے بیس سال گویا وہاں گزارے جہاں اردو کے سورج کی کرنیں نہ پہنچنے کے برابر تھیں۔ اس کے باوجود وہ اردو ادب کی تخلیق کرتے رہے۔ "شعلہ خاموش" اور "شورش پنہاں" اسی عہد کی یادگار ہیں۔ شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کے بیان کے مطابق یہ صنف چالیس برس سے پہلے قابو میں نہیں آتی۔ مگر "شعلہ خاموش" (رضا صاحب کا پہلا مجموعہ کلام جو 1968ء میں شائع ہوا تھا) کے مطالعے سے یہ آگہی ہوتی ہے کہ رضا صاحب چالیس سال کی عمر سے بہت پہلے رباعی کہنے کا آغاز کر چکے تھے "شعلہ خاموش" کی رباعیوں پر جو سنہ عیسوی دیے گئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اس صنف پر پچیس سال کی عمر ہی میں قابو پالیا تھا۔ اب انہیں اس پر پورا پورا عبور حاصل ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ افریقہ کے صحراؤں اور خارزاروں میں مقیم ہو کر یہ رباعیاں کہی گئی ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس نے مجھے یہ مضمون لکھنے پر اکسایا "شعلہ خاموش" کے تبصروں میں کوکن کے مشہور شاعر و ادیب بدیع الزماں خاور (مرحوم) نے تو اس مجموعے میں سب سے زیادہ کامیاب حصہ رباعی کا ہی قرار دیا۔ اس مجموعے میں انہوں نے چالیس رباعیاں ہی پیش کی ہیں۔ میں رضا صاحب

کے کافی قریب رہا ہوں۔ لہٰذا میں جانتا ہوں کہ اس وقت ان کی زنبیل میں رباعیوں کا اور بھی ذخیرہ موجود تھا اور بلاشبہ وہ ایک دن رباعیات کا الگ مجموعہ شائع کرکے میدان رباعی میں تہلکا مچا دیں گے۔ میرا یہ تصور سچ ثابت ہوا۔ 1980ء میں ان کی رباعیات کا علاحدہ مجموعہ "شعاع جاوید" کے نام سے شائع ہوکر اردو دنیا سے داد حاصل کرچکا ہے۔ "شعاع جاوید" کے پیش لفظ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ فرماتے ہیں:

"رباعی کو مشکل صنف کہا گیا ہے۔ شاید ہیئت کے اعتبار سے نہیں۔ معنی کے اعتبار سے کہ تین مصرعوں میں بات کو کھولنا اور چوتھے مصرعے میں مکمل کرنا صرف مصرعے جوڑنے کا معاملہ نہیں بلکہ اکمل' اس طرح سے ہو کہ نکتہ آفرینی کا حق ادا ہوجائے۔ یہ ہے رباعی کا کمال۔ کتنے اہل کمال اس پر پورے اترتے ہیں۔ چار مصرعوں کی "جگل بندی" تو سب کرلیتے ہیں۔ رضا کی رباعیوں کو پڑھ کر خوشی یوں ہوئی کہ ان میں خیال کو ہتھیلی پر پکڑنے' اس کے رنگوں کو گرفت میں لینے اور ان سے اظہار کا ہیولہ تیار کرنے کا جوہر ملتا ہے اور ان رباعیوں میں سوچنے والا ذہن ملتا ہے------"

"کالی داس گپتا (رضا) کی یہ رباعیات جو کم وبیش چالیس سال کی مشق سخن کی آئینہ دار ہیں' ہمارے عہد میں رباعی گو کا اعلیٰ معیار قائم کرتی ہیں۔ یوں تو عشقیہ جذبات یا مناظر فطرت کی عکاسی یا زندگی کے روزمرہ کے معاملات کی تصویر کشی پر مبنی رباعیات کہی گئی ہیں اور ایسی رباعیاں بھی کم نہیں ہیں جن میں خود کلامی کی کیفیت ملتی ہے۔ کالی داس گپتا (رضا) کی رباعیاں بیشتر تفکری رنگ کی حامل ہیں۔ یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ شاعر عام انسانی سطح سے کچھ بلند ہوکر عام شاعرانہ آواز سے کچھ اونچی آواز میں گفتگو کر رہا ہے۔"

عبداللہ کمال فرماتے ہیں۔

"یوں تو رضا صاحب کی دوسری اصناف شعری بھی اسی خوبی وصفائی زبان' وسعت فکر اور لطافت ونفاست تخیل سے مملو ہیں' لیکن رباعیوں میں پرواز فکر جس

وقار و تمکنت، تہہ داریت اور انسانی جذبہ خیر سگالی سے آشنا ہوئی ہے اس سے ان کے ذہنی افق کی وسعت اور رباعی کی امکانی حدود میں کشادگی کا اندازہ ہوتا ہے۔۔"

"شعلہ خاموش" کے منظر عام پر آتے ہی یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ رضا صاحب کو اردو شاعری کے فن پر قدرت حاصل ہے اور یہ کہ انہوں نے ہر صنف میں خوبصورت پھول کھلائے ہیں۔ مگر رباعی جو کہ مشکل ترین صنف ہے ان کے لیے آسان ترین مشغلہ ہے۔ انہوں نے اس فن کی باریکیوں اور گہرائیوں کو ناپ لیا ہے۔ انہیں علم عروض پر بھی عبور حاصل ہے اس کی ایک مثال مجھے یاد ہے۔ رسالہ شاعر بمبئی شمارہ نمبر12-1967ء میں "لحن صریر" پر ادارہ، شاعر کی جانب سے تبصرہ شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ پاکستان کے مشہور شاعر عبدالعزیز خالد کی رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس تبصرے پر کم وبیش شعراء اور نقادوں نے تعریف کے پل باندھ دیئے۔ اس میں چند ایسے مصرعے دیئے گئے تھے جو ادارہ شاعر کے تبصرہ نگاروں کے خیال کے مطابق اوزان سے باہر تھے۔ رضا صاحب نے ان تمام اوزان کی جامی کی مشہور رباعیوں سے مثالیں دے کر مصنف کو اس کا حق دلایا۔ ہندوپاک میں بہت سے علم عروض کے ماہر ہیں۔ کسی سے یہ نہ ہوا کہ مصنف کو اس کا جائز حق دلوا سکے۔ رضا صاحب کی یہ مثالیں رسالہ شاعر کے شمارہ 4 اور 5، 1968ء میں شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا حالی وہ پہلے ادیب وشاعر ہیں جنہوں نے اپنے کلام میں قوم و وطن کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی سعی کی۔ اپنے ملک وملت سے ان کی الفت کسی بڑے محب وطن سے کم نہ تھی۔ لیکن اخوت اور محبت کا تقاضہ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے مانند محض بیداری انقلاب کے بلند نعروں سے پورا نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اس کے لیے ملت کی بے لوث خدمت کرنا، فرقہ وارانہ منافرت کو مٹا دینا اور سب سے برادرانہ تعلقات رکھنا ضروری تھا۔ رضا صاحب نے ہرچند افریقہ کے صحراؤں کی بیس سال خاک چھانی اور ان کی شاعری یہیں پروان چڑھی۔ لیکن ان کے دل میں اپنے وطن سے دور رہ کر بھی وطن پرستی کا جذبہ امڈتا رہا۔ وہ فرقہ وارانہ

تعصبات کو مٹانے کے دل سے متمنی تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مذہب کے نام پر بھائی بھائی میں خون کی ہولی کھیلی جائے۔ شیخ و برہمن' دیر و حرم کے جھگڑوں سے قوم ابھر نہیں سکتی۔ ایسے خیالات کو انہوں نے اپنی رباعیوں میں کتنا حسین جامہ پہنایا ہے۔

باتیں ایک دوسرے کی سہنا سیکھو
دریا میں برنگ موج بہنا سیکھو
بے سود ہیں' یہ دیر و حرم کے جھگڑے
مل جل کر بھائیوں سے رہنا سیکھو

○

ہر وقت غم قوم مٹاتے رہنا
ہر حال میں کام اس کے آتے رہنا
تم بحر شجاعت کے شناور ہو رضا
طوفانوں میں بھی کشتی کو چلاتے رہنا

علامہ اقبال نے فلسفہ خودی کو اپنے اشعار میں اجاگر کیا کہ کوئی شاعر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ رضا صاحب بھی اس مقصد کی طرف آتے ہیں۔ وہ بھی اپنی قوم ہی سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔

جو قوم خودی دل سے مٹا بیٹھے گی
نام اپنا وہ مردوں میں لکھا بیٹھے گی
بلی بھی اگر ہوگی ضعیف و لاغر
کان اپنے وہ چوہوں سے کٹا بیٹھے گی

وہ کہتے ہیں۔

موج اپنا پتہ دیتی ہے اٹھ کر بہہ کر
ساحل نے صفت پائی ہے ثابت رہ کر

انسان کب انسان کہا جائے گا
دھتکارے جو دنیا اسے کتا کہہ کر

موج اپنی خودی کا اظہار اٹھ کر بہہ کر کرتی ہے۔ ساحل نے مضبوط رہ کر اپنی خودی کو قائم رکھا ہے۔ مگر کیا انسان کو اس وقت ہی ہوش آئے گا جب اسے دنیا کتا کہہ کر پکارے گی اس سے پہلے ہی کیوں نہ خودداری کو سمویا جائے۔ دل میں کیوں ایسے جذبات پیدا کیئے جائیں جس سے خودی کو ٹھیس نہ لگے اور ذلت اٹھانی نہ پڑے۔

اردو رباعی کو جن شعراء نے نکھارا اور سنوارا ہے ان میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا نام سرفہرست ہے۔ خاص کر ان کی تصویر کشی' منظر نگاری میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ رضا صاحب کا ذہن بھی مناظر قدرت سے خالی نہیں۔ ان کی یہ دو رباعیاں پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں' دیکھیے۔ کتنے حسین پیرائے میں اماوس اور پونم کی رات کی منظر نگاری کی ہے۔

ہر سمت رواں دواں ہے کالا دریا
تاریک مہیب' بے محابا دریا
دل کیسا بہا جاتا ہے بستی کی طرف
یہ رات اماوس کی کہ غم کا دریا

○

ہر سو ہے رواں دواں روپہلا دریا
پرنور' ضیابار' مصفی دریا
دل کیسا بہا جاتا ہے خنداں خنداں
یہ رات ہے پونم کی کہ ہنستا دریا

"شعلہ خاموش" کے دیباچے میں ایک جگہ آنریبل جسٹس چانن سنگھ فرماتے ہیں:
"شعلہ خاموش کا دیباچہ لکھنے کی ذمہ داری لینے سے قبل میں نے اپنے آپ کو

پورے طور پر رضا کی صاف گوئی کی سختیاں برداشت کرنے کے لیے تیار کرلیا تھا اور واقعی مجھے ان سختیوں سے دو چار ہونا بھی پڑا کیونکہ موجودہ زمانے میں انصاف کا پلڑا امیر طبقے کی جانب ہی جھکتا ہے۔"

قانون کو سیم و زر سے تلتے دیکھا
اکثر بھرم انصاف کا کھلتے دیکھا
اڑتی ہے جو خاک عدل کے رستوں سے
منصف کو اسی خاک میں رلتے دیکھا

چونکہ آنریبل جسٹس چانن سنگھ کا تعلق بھی کینیا کے قانون اور عدالت سے تھا' لہٰذا وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"رضا صرف منصفوں اور عدالتوں پر ہی برستا نہیں' وہ اپنے طبقے یعنی زرداروں پر بھی یکساں طور پر حملہ آور ہوتا ہے اور موقع ملے تو دولت مندوں کی کھال کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ دولت مندی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اس کی آواز بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ وہ بھی بہت سے لوگوں کی طرح اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ زرداری کا ایک نہ ایک دن خاتمہ ہو کر رہے گا۔ لہٰذا وہ فرماتا ہے۔

زردار کو ہاتھ زر سے دھونا ہوگا
خود ساختہ اعتبار کھونا ہوگا
بکرے کی ماں منائے گی کب تک خیر
اک دن تو اسے حلال ہونا ہوگا

اردو ادب میں طنز و مزاح کی اہمیت بھی کم نہیں۔ ابتدا میں یہ شاید ہجو کی صورت میں نمودار ہوئی ہوگی اور رفتہ رفتہ اس نے طنز کی صورت اختیار کرلی۔ ہجو گوئی میں سودا کو مہارت حاصل تھی۔ مرزا یاس یگانہ چنگیزی نے طنز گوئی میں کسی کو نہیں چھوڑا اور اپنے کلام میں بڑے بڑے شاعر کی پگڑی اچھالنے سے بھی باز نہ رہے۔ یگانہ آرٹ نے اردو ادب میں کچھ ایسی شہرت حاصل کرلی کہ تھوڑے سے عرصے میں مرزا یاس کا نام جگمگانے لگا۔ یگانہ کے بعد واہی' کنہیا لال کپور' غلام احمد

فرقت' دلاور فگار کے نام پیش پیش ہیں۔ آپ کو ہم رضا صاحب کی چند رباعیاں بھی سناتے ہیں۔ ایسی شاعری کے خلاف جو علم عروض کی دھجیاں اڑانے اور فن شاعری کو مٹانے میں کوشاں ہیں۔ یہ رباعیاں بہت عرصہ پہلے کہی گئی تھیں۔

برسوں سے رواں دواں ہو جس رستے پر
اسلاف نے جس راہ میں ڈھوئے پتھر
اے شاعرو بدلو نہ اسے ہوش کی لو
بوڑھے کو نئی پگڑی سجے گی کیونکر

○

محفل میں کئی ٹاٹ کے پیوند ملے
محفل میں بہت تھوڑے ہنر مند ملے
چالیس میں بس پانچ ہی شاعر ہوں گے
باقی جو تھے پینتیس وہ "تک بند" ملے

کچھ ایسے فنکار بھی ہیں جو فن عروض کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے اور مصرعہ اول اور مصرعہ ثانی اور مصرعہ چہارم میں قافیہ رکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ رباعی ہو گئی۔ رباعی کے اوازن ہیں جو بحر ہزج سے نکلے ہیں اور ان کی تعداد چوبیس ہے۔ ان کے متعلق رضا صاحب کی ایک رباعی ملاحظہ فرمایئے۔

اوزان غلط سے اپنا دامن بھر لو
بے راہ روی کا بوجھ سر پر دھر لو
قطعوں کو رباعیات کہنے والو
ارمان سخن وری کا پورا کرلو

1985ء میں رضا صاحب کی رباعیات کا جو مجموعہ "شعاع جاوید" کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں کم وبیش ایک سواسی (180) رباعیاں ہیں۔ ان میں پہلے مجموعہ ہائے کلام میں شائع شدہ رباعیاں بھی شامل ہیں مگر بیشتر رباعیاں نئی ہیں۔ ملاحظہ

کیجئے۔

سورج میں ہوں، چاند میں ہوں، ہالا میں ہوں
اول سے اخیر تک اجالا میں ہوں
بخشی ہے حیات کو شعاع جاوید
ظلمات کو مات دینے والا میں ہوں

○

فانی نہ کہو، ہوتا ہے کم اس کا وقار
انسان کا ہوتا ہے دوامی کردار
مایوس ہو کیوں وقت کی ظلمت سے کوئی
ہر رات سے پیدا ہیں سحر کے آثار

○

رحمان ہے تو سزا جزا رہنے دے
تکبیر کے پرچم کو گڑا رہنے دے
اب جشن بہار، اب خزاں، یہ سب کیا
اک بار جو کھل گیا کھلا رہنے دے

○

ہاں، حال کی پیروی سے ٹل جائیں گے
مستقبل کی صدا میں ڈھل جائیں گے
تم وقت کے ہمراہ نہ پاؤ گے ہمیں
ہم وقت سے کچھ آگے نکل جائیں گے

ایک رباعی جوش کے رنگ میں:

یہ کون کھلے رستے بڑھی آتی ہے
میں نیند میں ہوں اور یہ اٹھلاتی ہے

اتنے میں سحر پائنتی آ کر بولی
"بندی ہے آداب بجا لاتی ہے"

گپتا رضا صاحب اس وقت آسمان ادب کے درخشاں ستارے ہیں۔ شاعری' تحقیق' تنقید میں ہندوپاک کی نامور شخصیات میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ہمارے درمیان مشرقی افریقہ میں گزارا۔ ہمارے لیے ان کے حلقہ احباب میں شامل رہنا از خود ایک فخر ہے۔

مذہبیات کا رچاؤ

رضا صاحب کے یہاں جذباتیت کی جانبداری کا جوش سوار نہیں ہے۔ تاہم ان کے تیسرے مجموعہ کلام "شاخ گل" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ایک ذہنی کاوش ہندو مذہبیات کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کے لیے بھی رہی ہے۔ شاخ گل میں چار علی الترتیب نظمیں، فتح و شکست..... ترک دنیا کیوں؟..... بھگوان بدھ کا تیاگ۔۔ اور امرت منتھن ص ۱۶ تا ص ۳۲ ملتی ہیں۔ اردو سے متعلق بحث میں رضا نے اسے مسلمانوں سے چھین کر عام انسانوں کی میراث بنا دینے کا بیڑا نہیں اٹھا لیا ہے۔ لیکن خدمت اردو جس ڈھنگ سے وہ کر رہے ہیں وہ اردو والوں کے لیے سبق ہے۔

"فتح و شکست" کے بارے میں خود کالی داس گپتا رضا نے اپنے عرض حال میں صفحہ 9 پر لکھا ہے "رگ وید ہندوؤں کی پہلی مقدس کتاب ہونے کے علاوہ ہند پوربی آریائی اقوام کا قدیم ترین اور اہم ترین ادبی ورثہ ہے۔ میں نے "فتح و شکست" کے عنوان کے تحت رگ وید کے پہلے منڈل کے تیسویں سنوکت کو اردو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ اردو والوں کے لیے ویدوں کے تراجم کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ مگر یہاں تو حال یہ ہے کہ فاضل مبصر کے پاس جب "شاخ گل" گئی تو انہوں نے تبصرہ میں ہندو مذہبیات کے اوزان کو بھی نظر انداز کرنے میں عافیت سمجھی اس کا مقصد بھی تھا۔

"ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں"

رضا نے عرض حال میں کہا ہے۔

"ترجمہ سائنتا چاریہ اور دوسرے مغربی ویدک عالموں کی تحریروں کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ جو بیک وقت روایتی بھی ہے اور لغوی معنی کے مطابق بھی مگر شعر (خصوصاً" رگ وید کی شاعری) کے مطالب محض لغت کے پابند نہیں ہوسکتے۔ ان میں علم صرف کو کام میں لانا ضروری ہے۔ یہاں الفاظ کی ساخت اور ان کے معنوں سے بحث کرتے ہوئے آگے بڑھنا پڑتا ہے اور جابجا صنائع وبدائع میں لپٹے ہوئے حقائق کو بے نقاب کرتے جانا ہوتا ہے اس لیے حقیقت تک پہنچنے کے لیے یورپین اور دوسرے نامور عالموں سے اتفاق نہ کرنے والے ودوانوں' یعنی اوبندر گھوش' سوامی دیانند وغیرہ کی شرحوں کو بھی مطالعہ میں لانا چاہیے۔

فتح وشکست کی کہانی بہت دلچسپ ہے' اس میں استعارہ کا فن آسان چھوتا نظر آتا ہے۔ پہلے کہانی خود رضا کی زبانی سنیے۔

روایتی شرحوں میں اندر ( ) کو اندر دیوتا اور ورتر ( ) کو سانپ' اجگر وغیرہ مانا گیا ہے' مگر سوامی دیانند نے اندر کے معنی سورج اور ورتر کے معنی بادل کہے ہیں' سورج اور بادل میں ہمیشہ آپس میں لڑائی سی ٹھنی رہتی ہے جب بادل بڑھتا ہے تو وہ سورج کی روشنی کو ڈانپ لیتا ہے۔ اور سورج کا تیج بڑھتا ہے تو وہ بادلوں میں سے چھن کر بھی اپنی روشنی پھیلا دیتا ہے' جب بھی کوشش کرکے کالے بادل تمام آسمان کو چھپا لیتے ہیں' حتیٰ کہ سورج کی کرنیں بھی اس میں سے گزر نہیں سکتیں۔ تب بارش برستی ہے۔ اور بادل زمین پر چاروں شانے چت آگرتا ہے۔ ندی نالے زور وشور سے بہنے لگتے ہیں۔ بادل کو بجلی اور گھن گرج کے ہتھیار بھی اس شکست سے نہیں بچا سکتے اور سورج کی فتح ہوتی ہے۔ انہیں سورج اور بادل کی آکاش میں جنگ ہوا کرتی ہے۔ جس میں انجام کار بادل ہارتا ہے اور سورج بلا شبہ فتح یاب رہتا ہے۔"

اب نظم پر آجایئے۔

اس نظم کے ابتدائی درمیانی حصہ میں یہ تشبیہ کتنی نادر ہے۔

جیسے دیکھ کے بھوکے اور پیاسے بچھڑے کو

گائے کے تھن سے بہنے لگی ہو دودھ کی ندیا

انسانی مشاہدے کی جاذبیت کو ملاحظہ کیجئے۔

آگے ایک موقع پر جب اجگر (بادل) تمازت اندر (دھوپ) سے تپش پاکر زمین پر برس جاتا ہے۔ وہ سماں فتح و شکست کا خاص موقعہ ہے جب:

مرے ہوئے اک بیل کی مانند اجگر پر سے
بہنے لگی ہیں کیسی اپنی موج میں ندیاں
وہ طوفانی ندیاں جن سے بھر رکھے تھے
اس اجگر نے اپنے تہہ خانے اور زنداں

آگے کا منظر بھی کچھ کم نہیں۔ فن تشبیہ کی اہمیت کا احساس تابندہ کرتا ہے۔ دیکھیے۔

اجگر کی ماں یہ سب سن کر دوڑی آئی
اندر نے لیکن اپنی کڑک سے اسے بھی پکڑا
وہ بھی اپنے بیٹے پر اب گری پڑی ہے
جیسے سوئے پڑے ہوں یکجا گئو اور بچھڑا

اب اس نظم کی سائنسی حیثیت دیکھیے جو صداقت کا جامہ پہنے ہوئے ہے۔

بادل ٹوٹ کر برس چکا ہے' پیاسی زمین کے منہ میں پانی چوایا جاچکا ہے' زمین کی تہوں میں ایک ایک بوند پانی پہنچ کر اسٹور ہوچکا ہے' وہ چونکہ میل مٹی' کیچڑ' غلاظت نہ معلوم کس کس مادہ سے ہم رنگ ہوتا ہوا' زمین کی کوکھ میں اترتا ہے۔ اس کی لفظی پیکر تراشی اس طرح ہے۔

ندی کی تہہ میں اجگر کا بے رنگ تن و توش لاکھوں من پانی کے نیچے دبا ہوا ہے۔

تیز بہاؤ' سمٹتا' بڑھتا' بے تابانہ
اجگر کے بے روح خدا کو روند رہا ہے
یہ پانی جو کبھی تھا اجگر کے قبضے میں

مدت کے بعد آج کہیں آزاد بہا ہے
وہ اجگر جو اندر کی کایا کا دشمن تھا
لامتناہی ظلمت میں بے جان پڑا ہے

رضا نے آخری مصرع "لامتناہی ظلمت میں بے جان پڑا ہے" کہہ کر جو ترجمہ کا حق ادا کیا ہے۔ اسے ایک مترجم ہی محسوس کر سکتا ہے۔

فن تشبیہ کے حسن کی تابندگی دیدوں میں بھی ملتی ہے' گویا اس وقت تمثیلات کا آرٹ موجود تھا' ہزارہا برس پہلے سنسکرت میں تمثیلی فن کی موجودگی کا مفہوم اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ صورت گری اور مجسمہ سازی بھی ادب میں اسی طرح معاون ثابت ہوتی ہے' جس طرح وہ روح کی گہرائیوں میں اتر کر قلب کو جگمگانے میں مدد دیتی ہے۔ کہیں سے عقیدت مندی کے سوتے پھوٹتے ہیں اور بت سازی سرشت ہونے لگتی ہیں۔ ایک تمثیل ملاحظہ ہوں۔

جیسے لٹیروں نے انجانے چرواہوں سے
چھین کے بے چاری گائیوں کو قید کیا ہے

دراصل روپ ریکھا کو جب ہم خیال کے جسم سے نکال کر پتھر میں ڈھال دیتے ہیں تو بت وجود میں آجاتا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ پتھر کا ہوتا ہے۔ مگر اس سے خالق کے آرٹ کا جمال چھن چھن کر نکلتا ہے' جیسے ہر آنکھ نہیں دیکھ پاتی' کچھ مخصوص آنکھیں ہی اسے دیکھ پاتی ہیں یہ میرا کی آنکھ ہوتی ہے' یا سورداس کی وہ آنکھ جسے آپ پھوٹی آنکھ سمجھتے ہیں۔ یا پھر ایک شاعر اسی لطف وکیف کو لفظی صورت میں ڈھال دیتا ہے' تو نظم وجود میں آتی ہے۔

سنسکرت ادب اس عظیم سرمائے سے لبریز ہے۔

ایک اور تمثیل بند دیکھیے۔

اندر تیری باہوں میں ہے بجلی کا کوندا
تو جڑ کا چیتن کا دونوں کا پالک ہے
تو حیوانوں انسانوں کا سب کا سوامی

تو راجاؤں رنکوں کا سب کا رکھشک ہے
جیسے آروں کا رکھشک ہیمنے کا گھیرا

کتنے شعراء اس نادر تشبیہ کو استعمال کرنا جانتے ہیں۔ استعمال کا شعور تو دور کی بات ہے۔ اسے سمجھنے کا سلیقہ بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ رضا نے شاخ گل کے عرض حال میں صفحہ 10 پر لکھا ہے کہ:

"یہ سوکت ترشٹپ چھند میں ہے۔ میں نے ترجمے کا وزن بحر متقارب بارہ رکنی مقرر کیا ہے۔ یہ چھند کے وزن کے تو زیادہ قریب نہیں۔ مگر اس کے مزاج کے کافی قریب پہنچ گیا ہے۔ ویدک سنسکرت کے اوزان اردو عروض کے اوزان سے اس قدر مختلف ہیں کہ ہمارا کوئی وزن شاید ہی کما حقہ ان پر پورا اتر سکے۔ واضح ہو کہ اندر کو ہر جگہ بروزن فاع رکھا گیا ہے۔ فعلن یعنی ان در کے وزن پر نہیں۔"

آگے رضا نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نظم کو ہندی مزاج کے پیش نظر کہیں کہیں متقارب وزن سے انحراف جائز رکھا گیا ہے۔ اس سے یہ وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ رضا کو بحور و اوزان پر کتنی قابل رشک قدرت حاصل ہے اور پھر اس کی وضاحت بھی کردی ہے یہ بات ان کی محققانہ دیانت داری کو ظاہر کرتی ہے۔

صفحہ 33 پر "ترک دنیا کیوں؟" کے عنوان سے ایک نظم ہے جو سنت گیانیشور اپنے باپ وٹھوبا کو جو ترک دنیا کرکے بن کو سدھار گیا ہے۔ واپس گھر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور کچھ قیل و قال کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔

رضا رقم طراز ہیں کہ:

"مہاراشٹر کے نامور سنت گیانیشور 1275ء تا کارتک 1296ء نے صرف 21 سال کی عمر پائی۔ ان کی سادھی پونہ کے نزدیک آلندی میں ہے۔ جس پر ان کے وصال کے تین سو سال بعد سنت ایکناتھ نے ایک مندر تعمیر کروایا تھا۔ جو اب تک قائم ہے لاکھوں عقیدت مند ہر سال ان کی سادھی پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں' وہ گیتا کے قدیم شارحین میں سے ہیں اور ان کی شرح جو "گیانیشوری" کے نام سے مشہور ہے۔ بہترین شرحوں میں شمار کی جاتی ہے۔ میری نظم "ترک دنیا کیوں؟" کا مرکزی

خیال اسی "گیانیشوری" سے لیا گیا ہے۔"

اس نظم کی خوبی اس کی صفائی' بندش' سادہ چست الفاظ' سیدھے اور روز مرہ کے استعمال میں ہے۔ اور پوری نظم چونکہ مذاکراتی ہے اس لیے اس کا ڈائیلاگ سسٹم بہت مضبوط ہے۔ بس ایک سلسلہ ہے جو چلتا ہے۔ میں نے اس طرح کی نظمیں اور بھی پڑھی ہیں۔ جن کے عنوان کا مکالمہ لیلیٰ مجنوں' گل وبلبل کی گفتگو' ہیر کا رانجھا سے خطاب کی طرح ہوتے ہیں' مگر ان میں اکثر تواتر کی کمی خار کی طرح کھٹکتی ہے۔ جگہ جگہ اکھڑے اکھڑے سوالات وجوابات ملتے ہیں۔ مکالمہ مصنوعی محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اس نظم کی خوبی اس کی سادگی اور صاف مزاجی' مکالمہ بالکل صاف اور سلجھا ہوا ہے۔ اگرچہ موضوع نہایت درجہ خشک ہے' جس سے طبیعت جلد اکتا سکتی ہے۔ لیکن یہاں ایک زنجیر قائم ہے۔ جس کی کڑیاں ایک دوسرے سے بالکل ملی ہوئی ہیں۔ اس ادبی سفر میں رضا کے ذوق سلیم اور جد مسلسل کے سوا کوئی رہنما نہیں۔

ساری نظم کا مرکزی خیال اسلام کی سماجی تعلیم ہی کی طرح ہے۔ یعنی گرہست آشرم سے بڑھ کر کوئی آشرم نہیں ہے۔ وٹھو باجی کو خاص پکی عمر میں بھی سکون قلب نصیب نہ تھا۔ لیکن گیانیشور جیسے گیانی کو قدرت نے دولت خاص سے نوازا تھا۔ سکون قلب جنگل میں ہے یا گھر میں۔ اس مسئلے کو کتنی صفائی اور چابک دستی سے بیٹے نے باپ سے بحث کرکے سمجھا دیا ہے۔ وٹھو باجی تارک الدنیا ہونے جارہے تھے۔ انہیں اس راستے سے باز رکھنے کے لیے خود گیانیشور کو کتنی مشکل پیش آرہی ہے۔ آخر کار گیانیشور نے' جب دوئی کے مسئلے پر باپ اڑے رہے ہیں' ایک' شقل بات کہہ دی۔

آپ کیوں رنگ دوئی پر ہیں فدا
عارفوں کو جہل سے کیا واسطہ

گویا عارف کا کام دوئی کے گورکھ دھندے میں رہنا نہیں ہے' بھلا مرد عارف من وتو کے فرق کو کیا جانے۔ آگے ایک مضبوط دلیل دی ہے۔ اس سادہ بات کو اتنی

سادگی سے کتنے دانشور بیان کرسکتے ہیں۔

لعل مخزن میں ہے یا زیر زمیں
اپنی قیمت تو کبھی کھوتا نہیں

آخری بات تو ایسی صداقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

ہر کہیں ہے قادر مطلق کا گھر
کون گھر ہم جائیں یہ گھر چھوڑ کر

پوری نظم میں آزاد ترجمہ کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ البتہ یہ معلوم نہیں کہ اس میں اصل کے مطابق کتنا مواد لیا گیا ہے یہ ضرور ہے کہ جس اعتماد سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ وہ مہارت و مشق کا ایسا اظہار ہے جس سے کہیں ترجمہ کا شائبہ تک نہیں جھلکتا۔

اس نظم کے ذریعے ہم رضا کے اس ہتھکنڈے سے واقف ہوجاتے ہیں۔ کہ وہ آزاد ترجمہ ہی سہی مگر اس اٹھان سے قبل اپنے موضوع کو ذہن میں پورا ریکارڈ کرلیتے اور اس پر قدرت کاملہ کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں۔

بھگوان بدھ کا تیاگ

یہ نظم چودہ اشعار کی ہے۔ کوئی تاریخ کا طالب رہا ہو یا نہ رہا ہو' لیکن یہ واقعہ بہت معروف ہے اور ہر زبان کی نثری کتابوں میں درج ہے۔

"بدھ ان بزرگوں میں گزرے ہیں۔ جنہیں آلام روزگار سے براہ راست سابقہ نہ پڑا۔ لیکن مصائب حیات پر انہوں نے جس تپسیا سے عرفان ذات حاصل کیا ہے' وہ کچھ اتنا گہرا ہوگیا کہ انہوں نے کبھی خدا کے لیے کچھ نہ کہا۔ بس نیکی و ایثار پر زور دیا' رضا نے کہا ہے۔

"بھگوان بدھ کی عظیم شخصیت کو کون نہیں جانتا' ان کی عظمت کا سورج پچیس سو سال سے برابر نور برساتا چلا آرہا ہے۔ بھگوان مہاویر (جین مت کے بانی) بھی عظیم ہستی اور بھگوان بدھ کے ہم عصر تھے' مگر ان کی زندگی کی کہانی میں عام آدمی کے لیے وہ کشش نہیں ہے جو بھگوان بدھ کے سوانح میں ہے اور بھگوان بدھ کے سوانح میں ترک نیا کا واقعہ سب سے پرکشش ہے۔

ایک بڑی شخصیت کی حیثیت سے گوتم بدھ نے جس طریق زندگی پر زور دیا ہے' اسے لنکا' برما' چین' جاپان' جاوا' سمترا اور ہندوستان کے بودھ بالکل بھول چکے ہیں۔ بودھ راہبوں نے اپنے اپنے طور جن منازل کا تعین کیا ہے وہ کسی بھی طور پر مذہب میل نہیں کھاتیں' ان راہبوں نے خود کو ہندو کہلانا بھی پسند نہیں کیا ہے۔ وہ خود کو ہندو ازم سے الگ تصور کرتے ہیں۔ ادھر ہندومت کا دعویٰ ہے کہ ہندوؤں کے دوسرے فرقوں کی طرح بدھ فرقہ بھی ہندو دھرم کا ایک حصہ ہے۔"

رضا نے اس واقعہ کو بھی اپنے مزاج کی سادگی کے تحت نظر بند کیا ہے۔ ایک ایک شعر میں سماں بندھ گیا ہے۔ مثلاً" راجہ اور رانی گہری نیند میں ہیں۔ اسے یوں کہا ہے۔

راج محل میں راجہ رانی سجل سجیلی سیجوں پر
لمبی تانے سوئے ہوئے ہیں راج کی چنتا کو تج کر

مصرعہ ثانی میں محاورہ کا کیا برمحل بیان ہے۔

پوری نظم پڑھنے کے قابل ہے۔ پہلا ہی شعر پورے سین کی اٹھان کا پتہ دیتا ہے۔

آدھی رات مگن بدھ ماتی
کم کم چمکتے ہر تارا
گھٹتی گھٹتی چاند کی پرتھا
بڑھتا بڑھتا اندھیارا

یا پھر نظم کا آخری شعر جو پوری نظم پڑھنے کے بعد ایک خاص تاثر چھوڑتا ہے۔

دن چڑھ آیا سورج نکلا
پیڑ کی چھایا بڑھنے لگی
شب بھر کی سوئی بن دیوی
راج سنگھاسن چڑھنے لگی

شاخ گل کے صفحہ 32 پر ایک نظم "امرت منتھن" ہے۔ اس نظم کے بارے میں خود رضا قلم طراز ہیں۔ "امرت منتھن" یا "سمدر منتھن" ہندو دیومالا کی ایک

اہم کتھا ہے۔ اس میں سمندر کو بلو کر امرت نکالے جانے کا ورنن ہے۔ میری (رضا) نظم کا انداز ڈرامائی سا ہے۔ یعنی سمندر متھا جا رہا ہے۔ صندر گری (ایک پہاڑ) سے منتھن کا اور آدی شیش سے رسی کا کام لیا جا رہا ہے۔ رسی کو ایک سرے سے دیو یعنی دیوتا اور دوسرے سے دانو یعنی اسرا کھشش وغیرہ کھینچتے ہیں۔ یکایک ایک بڑے ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی امرت سے بھری گاگر برآمد ہوتی ہے جسے راکھشش اڑا لے جاتے ہیں۔ دیوتا کو بے حد مایوسی ہوتی ہے' اور وہ بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ وہ ان کی مدد کرے' اتنے میں ایک چھل چھبیلی نرتکی غیب اسٹیج موہنی انتم کرتی ہوئی جلوہ گر ہوتی ہے۔ راکھشش اپنے مزاج سے مجبور اس نرتکی کے روپ پر مست ہوجاتے ہیں اور امرت کی گاگر ان کے ذہن سے محو ہوجاتی ہے' جسے موقع پا کر دیوتا اٹھا لے جانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں' ظاہر ہے کہ نرتکی کے روپ میں بھگوان وشنو کے سوا اور کوئی نہ تھا۔"

ایک جملہ رضا نے اس سلسلہ میں یہ بھی کہا ہے کہ:

"امرت منتھن کی یہ کتھا اردو نظم میں شاید پہلی بار دیکھی جائے گی۔ مگر یہ میرا دعوی نہیں قیاس ہے۔"

یہ نظم کیا ہے' ایک عجیب سا سلسلہ ہے۔ اس دیومالائی کیفیت کو سمجھنے کا جس کے تحت پہلا مصرع:

"گڑگڑ گڑگڑ گھم گھم گھم گھم" سے منتھن کی آواز نکلتی ہے اور پھر دوسرے مصرع:

"جھالے' جھاگ' جھنا جھن' جھم جھم" سے نتیجہ نکلتا ہے۔ جن لوگوں نے صبح کے وقت پوپھٹے سے قبل گاؤں کے گھروں میں سے دودھ متھنے کی آواز سنی ہے' وہ اس شعر کا صحیح لطف لے سکیں گے' جہاں بلونی سے دودھ بلو کر دودھ' دہی' مٹھا' مسکا کی شکلیں نکالی جاتی ہیں' یہی:

"جھالے' جھاگ' جھنا جھن' جھم جھم" ہے پھر اس کیفیت کو رضا نے دہرا روپ دیا ہے کہ:

ایک ہوئے پاتال اور گردوں

مندر گری کی متھنی چلائی جا رہی ہے۔ انجام کار کے لیے اس مصرع:

دھل دھل' دھل دھل' لت پت' لت پت

سے رضا نے جو تجسیم کاری اس وقت سمندر کی دگرگوں حالت کی پیش کی ہے۔ اس سے ان کے سادہ انداز بیاں نیز ان کے خزینہ الفاظ (VOCABULARY) کا حال کھلتا ہے۔ دیو اور دانو جو دونوں ہی ہوس کے مارے ہیں۔ ان کی تھکن کے اظہار کے لیے یہ مصرع ہے کہ:

سانس' شرارا' جسم پسینہ

نے جو جانفشانی اور خون پسینہ ایک کردینے والی کیفیت اجاگر کی ہے' یہ کھیل نہیں۔ امرت منتھن میں جو کیفیت اتھل پتھل کی ہو سکتی ہے وہ:

جھالے' جھاگ' جھنا جھن' جھم جھم

سے تو بے شک ظاہر ہے۔ مگر اس میں اتھل پتھل کیفیت تیزی اور انسانی محنت کی تھکن کا بھی عظیم اظہار ہے۔ پھر کوئی شے چمکتی نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی منظر کشی کا یہ بیان کہ:

کوئی ہنڈا' جگ مگ' جگ مگ
کوئی گولا' دگ دگ دگ دگ

یا پھر:

اتم' اجول' اگر' اجاگر
یہی تو ہے امرت کی گاگر

ان اشعار میں رضا کی بیانیہ عبارت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ اس طرح کے بیان کے لیے ایسے الفاظ کا انتخاب جو اس کے لیے موزوں ترین ہوں' بالکل اسی مفہوم کو ادا کرتے ہوں' پھر روز مرہ ہندی الفاظ کا استعمال یہ سب بیان کلیجہ منہ کو لے آتا ہے۔ اب دیو اور دانو میں جھگڑا شروع ہو چکا ہے۔ دانو گاگر لے بھاگے تھے۔ وہ اسے پینے کے قریب ہیں کہ:

آنا" فانا" چھم چھم چھم چھم
ڈمرو، گھنگھرو نغمہ، سرگم

یہ کون آیا۔ دراصل یہ:

بھومی پروشنو کی پتری

جس کے حسن وشباب کا یہ عالم ہے:

میوہ سی گدرائی باہیں
ترچھی نظریں، ٹیڑھی راہیں

یا پھر۔

موہنی جیسے جگن کی مایا
روپ جیسے دھوپ میں سایا

آگے چل کر رضا نے اپنے پر اثر قلم کاری کا یہ چمت کارانہ انداز بھی دکھایا ہے کہ:

زلفیں جیسے شام کی سج دھج
چہرہ جیسے چڑھتا سورج

یا پھر اسی کے آگے انھوں نے روپ رانی کی صورت کا جوبن اس طرح دکھایا ہے کہ:

مورت جیسے روپ کی رانی
جوبن جیسے باڑھ کا پانی

چڑھتے جوبن کا اظہار کتنا صاف اور صادق ہے۔ آگے کہتے ہیں۔

نٹ کھٹ اہلی کبھی پھرتی
تہہ کی بیٹھی سطح پہ ترتی

رضا نے حسن کی فسوں کاری سے زیادہ اس کی فطری سادگی کا بیان ملحوظ رکھا ہے۔ یہ احساس اگرچہ ناپید نہیں لیکن اتنا سنجیدہ ہے کہ خود سنجیدگی کی تہہ در تہہ حسیت اس کا حصہ بن گئی ہے۔ خود رضا نے سنجیدہ مزاج حسن کاری کی سادگی کے بیان پر زور دیا ہے۔ اور پھر کہتے کہتے ایک شعر کہا ہے کہ:

برکھا کیا ہے دھوپ کے آگے

امرت کیا ہے روپ کے آگے

مصرع ثانی۔ "امرت کیا ہے روپ کے آگے۔ کامل وضاحت ہے۔ اس موقع کے سمجھنے کی جب:

دیکھ لے یہ انداز نرالے
دانو سدھ بدوہی کھو بیٹھے

جو کچھ ہونا تھا سب جانتے ہیں کہ:

کامنی، نغمہ، گھنگھرو، پایل
پھر سے ہوا سب آنکھ سے اوجھل

اس نظم کے ذریعہ یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے کہ رضا ہندو مذہبیات کے سرمایہ کو زندہ رکھنے کے پورے ہنر سے واقف تھے۔ مگر وہ کچھ تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ شاید اس لیے کہ اردو ادب نے یا اردو کے جدید مبصرین نے رضا کی اس کاوش نیک کو سراہا نہیں۔ اگر یہ اقدام سراہا جاتا، تو ان کو حوصلہ نصیب ہوتا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ہندو دیومالا کا ڈرامائی سرمایہ اردو ادب کی ناک میں نتھ پہنا دیتا، جس میں آج حسیت کی نکیل پڑی ہوئی ہے۔

رضا صاحب مستقبل اردو سے مایوس نہیں۔ مگر وہ موجودہ رفتار ترقی پر کچھ مطمئن بھی نہیں ہیں۔ اس لیے ان کو خدشہ ہے۔ اور وہ برملا کہتے ہیں:

جن کے ہاتھوں میں ہے وہ تجھ کو لے ڈوبیں گے
ہائے ری اردو، باگ تیری اب کون سنبھالے

حیات، موت اور تناسخ

اردو شعراء میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے موت و زندگی پر کچھ نہ کہا ہو۔ زندگی میں گھٹن، ناکامی، پسپائی، بے بسی، لاچاری اور بے وفائی و بے اعتنائی کے علاوہ شعراء نے دوسرا موضوع مسئلہ تناسخ (آواگون) کو بھی اپنی فکریات میں سمویا ہے۔ گویا یہ اضافہ ہے۔ مسلمان اس طرف سے یوں خاموش رہے کہ وہ سرے سے تناسخ کے قائل ہی نہیں ہیں، اگرچہ اس سے مذہب پہ کوئی ضرب نہیں پڑتی، مرزا مظہر جان جاناں نے تو اپنے ایک مرید کے استفسار کے جواب میں لکھا تھا۔

".....ان ہندوؤں کا سجدہ کرنا سجدہ تہنیت ہے..... سجدہ عبودیت نہیں۔ تناسخ پر اعتقاد رکھنے سے کفر لازم نہیں آتا....."

رضا صاحب کے اشعار میں بھی تناسخ ملتا ہے۔ ان کے اس نوع کے کلام کو دیکھیے، تو یہ محسوس کرنا دشوار نہ ہوگا کہ یہاں شاعر کا عقیدہ تناسخ کارفرما ہے۔ رضا صاحب اردو کی قدیم روایات کو عزیز رکھتے ہوئے ایک خاص جدت سے جو ندرت پیدا کر کے سامان لطف آفرینی پیش کرتے ہیں۔ وہ ان کی قدرت زبان کے ساتھ مشق سخن اور صالح فکر کا پتہ دیتی ہے۔ رضا بالراست اپنے مرحوم استاد جوش ملسیانی کے رشتے سے داغ اسکول کے پیرو ہیں۔ انہوں نے خود موت وحیات کے علاوہ مسئلہ تناسخ پر بہت اچھے اچھے شعر کہے ہیں۔ وہ اپنی ڈگر پر بہت مخصوص انداز میں اچھوتی فکر و نظر کے شاعر ہیں۔ رضا کے یہاں موت وحیات پر جو موضوعات ملتے ہیں۔ ان میں ایک اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ وہ زندگی کے مسائل پر بھی تیر اندازی کرتے جاتے ہیں۔

رضا نے ایک قطعہ میں زندگی کے مختصر ہونے پر بھی عجیب خیال پیش کیا ہے۔

جھک کے ڈالی نے پھول سے یہ کہا
حسن فطرت پہ افتخار نہ کر
رنگ و بو دو گھڑی کا سہرا ہے
ایسی عزت کا اعتبار نہ کر

اس قطعہ کی آخری شعر کی ندرت ملاحظہ کی آپ نے؟

اسی طرح کی کیفیت دوسرے قطعے میں اس طرح ملتی ہے۔

جس میں جھوٹی تسلیاں ہی ملیں
کچھ نہیں لطف ایسے جینے میں
کون دریا کو کر سکا ہے پار
بیٹھ کر کاغذی سفینے میں

یہاں "دریا" بحر زندگی کی اور "کاغذی سفینہ" عمر دو روزہ کی علامتیں ہیں۔

عزم و آرزو میں کہتے ہیں

جب کوئی کام کر گزرنے کی
خواہش باطنی نہیں ہوتی
مدعا مدعا نہیں رہتا
زندگی زندگی نہیں ہوتی

رضا کا مقصود فکر یہ ہے کہ زندگی جہد و عمل سے عبارت ہونی چاہیے۔ اور اس کے بغیر؟

"زندگی زندگی نہیں ہوتی"

ان کا تصور حیات بہت فرحت بخش ہے۔ وہ اسے تابانی بخشنے کے لیے سرگرم رہنا پسند کرتے ہیں انہیں پسماندہ طبقات کی فضیلت حوصلہ کا بخوبی احساس ہے۔ دیکھیے وہ کس بہتر طریقے سے اس کو مشروط کرتے ہوئے قدر افزائی کرتے ہیں۔

فقط جینے کا ڈھنگ آ جائے ان کو
بڑے شہزور ہیں' جو ناتواں ہیں

یا پھر۔

زندگی باعث شادمانی بھی ہے
دل کو غم میں نہ الجھاؤ' ہمت کرو

سچ ہے کہ زندگی صرف دکھ ہی دکھ نہیں ہے۔ بلکہ اسے شادمان کرنے کے لیے باہمت آگے بڑھنا ضروری ہے۔ زندگی کا لطف ہوس ناکی نہیں ہے۔

بھاگتا ہے مرنے سے' زندگی پہ مرتا ہے
کیسی کیسی راہوں سے آدمی گزرتا ہے

غور کیجیے لفظ "مرنا" کیا لطف پیدا کر رہا ہے۔

قید انسانی فطرت ہے۔ رحم مادر سے لے کر قبر تک اسے محصور رہنا اس لیے عزیز ہے کہ بغیر اس کے چارہ نہیں۔ وہ وسعت "گلزار ارم" سے گھبراتا ہے۔

کیا وسعت گلزار ارم میں مری ہستی
مجھ ایسا قفس دوست وہاں رہ نہیں سکتا

زندگی اور قید زندگی کو ملاحظہ کیجیے۔ عشق زندگی کا نمک ہے اور عشق زندگی کی تباہ کاری بھی ہے۔ درد و فریاد کے جنجال زندگی کے لازمی جزیات ہیں۔

زیست بے عشق ہے بے مزہ
عشق میں زیست برباد ہے
سر گزشت بشر کچھ نہیں
قصہ درد و فریاد ہے

زندگی بظاہر عیش طلب ہے۔ ورنہ اس کی فطرت کا آغاز و انجام تو رونا ہے۔ یعنی رضا ازل سے عرفان الم کا قائل ہے۔

ظاہرا" عیش طلب ہے بے شک

باطنا" زیست ہے شیدائے الم

رضا کو بخوبی اساس ہے کہ حرص کی کسوٹی پر زندگی کو کسنے والے زرپرست صحیح معنوں میں زندگی کے حقیقی لطف سے بے بہرہ ہیں۔

حرص کی کسوٹی پہ زندگی کو کستے ہیں
زر سے کھیلنے والے زندگی کو ترستے ہیں

نامرادی کی زندگی کا ایک راز یہ بھی ہے۔

سانس گویا دھواں ہے حسرت کا
آتی جاتی ہے سخت مشکل سے
زیست کی لو بھڑکنے والی ہے
شعلہ اٹھتا ہے آتش دل سے

نامرادی کی زندگی کا خیر مقدم یوں بھی ہوتا ہے۔

رضا نے اپنے طور پر زندگی کو خیر و برکت کا موجب قرار دے کر نہایت سادگی سے حیرت ظاہر کی ہے کہ:

آسماں سے رحمت کی بوند بھی نہیں گرتی
ابر زندگی والے اب کہاں برستے ہیں۔

ایک شعر میں سفر حیات کے نشیب و فراز اور دھوپ چھاؤں کو عجیب پیرائے میں بیان کیا ہے۔

مجھے عرش پر چڑھا دو کہ گرا دو آسماں سے
وہ ہے سرگذشت ہستی' یہ ہے زیست کا فسانہ

گویا عروج پر پہنچانا "سرگذشت ہستی" اور پستی میں گرانا زیست کا فسانہ ہے۔ یہاں یہ بھی محل نظر ہے کہ ہستی و زیست کو ایک لطیف سے تضاد کے ساتھ بیان کیا ہے۔

جینا سہل ہے' مرنا آسان ہے' فضا کے تمام راستے ملک بقا پر ختم ہو جاتے

ہیں۔

ہر گام دل زار کو بہلا کے چلو
کیوں عیش کو آرام کو ٹھکرا کے چلو
پہنچو گے اسی منزل ہستی پہ رضا
سیدھے چلو، الٹے چلو، بل کھا کے چلو

رضا کے یہاں موت سے پنجہ کشی اس کے مصائب، تکلیف عالم نزاع کو دراصل یوں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ کہ وہ اس کی ماہیت اور اس کے وجود کے قابل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک موت محض ایک راستے سے دوسرے راستے پہ جا نکلنے کا نام ہے، وہ اسے عجیب عجیب پیرایہ میں بیان کرتے ہوئے اپنا مدعا ظاہر کرنے میں کامیاب ہیں۔ وہ مسئلہ تناسخ کے شدت سے قائل ہیں۔ دراصل مسئلہ تناسخ اہل ہنود کے یہاں کوئی ارکان دین میں سے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسرے مذاہب پر ضرب نہیں لگاتا۔

رضا تناسخ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے کلام میں باوجود تلاش بسیار موت کے استعار نہیں ملتے۔ ان کے یہاں اتنا ہی ملتا ہے جتنا نظریہ تناسخ اجازت دیتا ہے۔ وہ موت کو تبدیلی جسم سمجھتے ہیں۔ اور اسے ایک انتہائی کیفیت قرار دیتے ہیں۔ صوفیائے کرام کا طبقہ روح کی ماہیت کے سوال پر علمائے تناسخ سے بہت حد تک متفق ہے۔ اور یہ عجمی تصوف کے ارکان واصول کے باعث ہے جس کے ڈانڈے ویدانیت کی اعلیٰ اقدار سے ملتے ہیں۔ صوفیائے کرام روح کے انتقال کو اپنے ماضی میں چلے جانے پر زور دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ موت کو "وصل" اور مرنے کو وصال کی اصلاحات میں یاد کرتے ہیں۔

ابھی کہا جاچکا ہے کہ رضا صاحب کے کلام میں عام مفہوم کے لحاظ سے موت پر فکر کیئے ہوئے اشعار کم ملتے ہیں، ان کے یہاں تناسخ نئے نئے انداز سے ملتا ہے، اور وہ ایک شگفتہ خیال بن جاتا ہے۔ درج ذیل اشعار دیکھیے۔

ابتدا سے یوں ہی ہوں گرم سفر

کون ہوں میں کدھر کو جاتا ہوں؟

یہاں مصرع ثانی کا استعجابی لہجہ ہی اس کا نظریہ ہے جو مصرع اولیٰ میں کہا گیا ہے۔

رہ زیست پہ ابد تک چلے ہم مسافرانہ
کبھی آگئے پلٹ کر، کبھی ہوگئے روانہ

گویا راہ زیست پر مسافرانہ روش بھی موت وحیات ہے۔

قضا کی اصل سے پائی رضا نے آگہی جب سے
قضا میں زندگی ہی زندگی معلوم ہوتی ہے

یہ شعر رضا کی جودت طبع کے علاوہ ان کے نظریہ تناسخ پر آگہی کی قسم بھی کھاتا ہے۔ نیز وہ پھر فضائے بسیط میں زندگی ہی زندگی محسوس کرتے ہیں۔

ملی ان کو نہ منزل زندگی کی، تو بھی غم کیا
رہ ہستی میں جو بھی تھک کے سوئے تازہ دم اٹھے

اس شعر میں کامل طور پر تناسخ جلوہ آرہا ہے۔ اس کی تشریح اختصار پسند نہیں۔ اسے دفتر چاہیے۔

یہ رباعی بھی اسی تناسخ کو پیش کرنے میں نمایا ہے۔

افگار مصائب سے ہے سینا میرا
مرنے ہی سے اب سنورے گا جینا میرا
موجوں کے تھپیڑوں سے اسے لڑنے دو
رہنے دو بھنور ہی میں سفینا میرا

پہلے شعر کے مصرع ثانی سے کتنا واضح ہے کہ ڈوب کر ہی ساحل پار کرنا ہوتا ہے۔

نظمیات میں بھی رضا نے اپنے نظریہ تناسخ پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

نظم "امید وبیم کی یہ سطور قابل غور ہیں۔

وقت پلٹے گا تو ندیم! عبث

اپنی حالت پہ ہاتھ ملتا ہے
دن کے جانے پہ رات آتی ہے
رات جاتی ہے دن نکلتا ہے

یہاں دن اور رات سے زندگی اور موت مراد ہے۔
نظم "کشمکش" کا پہلا بند دیکھیے۔

وہی میں ہوں، وہی ساحل، وہی موجیں، وہی طوفان
وہی اس پار میری زندگی
مجھ سے جدا ہو کر
دوبارہ مجھ میں آملنے کی سوزش میں تڑپتی ہے۔

غور فرمایئے کہ کس قدر کھلا تناسخ کا عمل ہے۔ جس کے لیے روح بے چین ہے۔
اس کے علاوہ رضا کی دو نظمیں "سرگذشت زندگی" اور "حیات و مرگ" ان کے دوسرے مجموعہ کلام "شورش پنہاں" میں درج ہیں۔ جن کا مطمح نظر خالصتاً تناسخ ہے۔

واضح ہوا کہ رضا کے کلام میں حیات و مرگ کے عنوان پر مسئلہ تناسخ بہت غالب ہے۔ وہ زندگی کو محض روح کے قالب میں حلول کرجانے کے بعد والی کیفیات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا اور انسانی جسم میں روح کی داخلیت کو انسانی زندگی سمجھتے ہیں۔ ایک بولتا ہوا شعر دیکھیے۔

حیات و موت سے ہوں خوب واقف
بہت اس راہ سے آیا گیا ہوں

تین نظمیں، ایک تجزیہ

ذیل میں کالی داس گپتا رضا کی تین سادہ اور مختصر نظموں علی الترتیب۔(1) "تمنا" (شعلہ خاموش مطبوعہ 1968ء)۔ (2) "حادثہ" (شورش پنہاں) مطبوعہ 1970ء (3) "لاوارث" (شاخ گل مطبوعہ 1975ء) کا تجزیہ قارئین کی نظر کیا جاتا ہے۔

(1) تمنا:۔ گپتا رضا نے تمنا کے تین روپ پیش کیے ہیں۔

اول "غنچہ"۔ دوم "حسینہ"۔ سوم "خواب"۔

رضا نے نظم کے پہلے بند میں تمنا کو "ارمانوں بھرا غنچہ" کہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رضا ارمان کو تمنا کا جزو خیال کرتے ہیں۔ اس میں پوری شاعرانہ لفظی رعایتیں اپنے عروج پر ہیں۔ مثلاً" دل کا کھل جانا۔ باغ۔ ہریالی مرجھا کے گرنا، گلشن وغیرہ۔

رضا نے اس میں ایک عام خیال کی صحت کو وسعت دی ہے کہ تمنا اگر تکمیل کو پہنچتی ہے تو دل کو شاداب کردیتی ہے۔ اور اگر وقت سے پہلے ہی خاک میں مل جاتی ہے تو سمجھئے کہ بدحالی سر پر آگئی۔

یہ انسانی سرشت کا خاصہ ہے۔ کہ وہ تمنا کو سرسبز دیکھنے کے لیئے دنیا بھر کے جتن کرتی ہے۔ جن میں شاید کسی کے باعث ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ جسے مقدر کا لکھا کہہ کر دل کو سمجھا لیا جاتا ہے۔ اگرچہ عمل نفسیات کا تقاضہ اس کے برعکس ہے۔ انگریزی کا مصرعہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

"اگر خواہشات گھوڑے ہوتے، تو بھکاری ان پر چڑھے پھرتے۔"

رضا نے اسی خیال کی نوعیت کے تحت تکمیل تمنا میں ناکامی پر نظر رکھتے ہوئے

یہ کہنا مناسب سمجھا۔

اگر کہنے سے پہلے ہی کہیں مرجھا کے گر جائے
نظر آنے لگے چاروں طرف گلشن میں بد حالی

دوسرے بند میں رضا نے تمنا کو "حسینہ" کا روپ دیا ہے کہ:

"تمنا اک حسینہ ہے بہت دلکش بہت دلبر" اور

یہ اپنے چاہنے والے کو ہر لحہ لبھاتی ہے

تمنا کا خیال تمنائی کو ہر لحہ لبھاتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ تکمیل تمنا میں کامرانی کا خیال نشہ بھرتا ہے۔ یہی کیفیت ایک دلکش و دلبر حسینہ کی ہوتی ہے۔ رضا نے دوسری اہم شرط پر بھی نگاہ ڈالی ہے کہ اگر حسینہ روٹھ جائے تو کیا ہوتا ہے' یہی ناکہ سارا جہاں ویران ہو جاتا ہے۔ اسی لیے رضا نے تمنا کے لیے کہا ہے۔

"اگر یہ روٹھ جائے تو خدائی روٹھ جاتی ہے"

رضا اس تمنا کی تکمیل اور اس کی کامرانی اور ناکامی کی صفات کو ایک اور روپ میں پیش کرتے ہیں۔ "یہ ہے وہ خواب پھولوں کا سدا جھولے جھلاتا ہے" کتنی سادہ عام فہم بات ہے' لیکن اس کی یہ خوبی کہ:

"مگر اس خواب کی تعبیر کوئی کہہ نہیں سکتا"

تمنا ہی کا وہ خواب ہے جس کی تعبیر کوئی نہیں بتا سکتا۔

مگر رضا "..... اس خواب کی تعبیر"- بتائے بغیر چپ نہیں ہو جاتے۔ بلکہ ایک امکان کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں۔ جو خواب کے پورا ہونے کی بشارت پر دلالت کرتا ہے۔

"جو یہ ہو جائے پورا تو زمانہ جھوم جاتا ہے"

"زمانہ جھوم" جانے کی بات سے جو کیفیت قلب ودماغ رضا نے پیش کی ہے۔ اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ گویا تکمیل تمنا پر ہر شے پر شباب آجاتا ہے۔ ہر طرف حسن نظر آتا ہے۔ چہار سمت زندگی اٹھکیلیاں کرتی محسوس ہوتی ہے۔ یہی شاعری ہے۔

رضا نے عارضی حسن سے مملو کیفیات کی خاص اشیاء کو اپنے بیان کا موضوع قرار دیا ہے۔ چونکہ سہ نامہ "تمنا" خود ایک عارضی شے ہے۔ جس کی تکمیل کا اثر بھی چند روزہ ہوتا ہے۔ پھر "تمنا" کو "غنچہ" "حسینہ" اور "خواب" سے مماثلت کرتے ہوئے اس کی ہیت سے نتیجہ اخذ کرنا ہی اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ وہ ایک انتہائی عارضی شے کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس لیے تمثیلات بھی وہی ہیں جو غیر دائمی ہوتی ہیں۔ "غنچہ" کے عارضی حسن سے متعلق شعراء کے دیوان میں عمدہ اشعار کا بہترخزانہ دیکھنے کو ملتا ہے' "حسینہ" بھی خود ایک عارضی حسن سے مملو شخصی نازوا ادا کا پیکر ہے۔ یہ حسن بھی "غنچہ" سے کہیں زیادہ عارضی ہے۔ "خواب" کو لیجئے وہ ان دونوں مندرجہ بالا اشیاء (غنچہ اور حسینہ) سے زیادہ عارضی ثابت ہوتا ہے' رات کو آپ کی بند آنکھوں میں ہوتا ہے اور صبح آنکھ کھلتے ہی غائب ہو جاتا ہے بند آنکھوں کا ایک خیالی گھروندہ۔

رضا نے ان تینوں حقائق پر اپنے فن کی مکمل گرفت کا ثبوت دیتے ہوئے۔ اسے فکری احساس سے لبریز کردیا ہے۔ یہی اس نظم کی خوبی ہے۔

(2) حادثہ:

رضا کے دوسرے مجموعہ کلام "شورش پنہاں" (مطبوعہ 1970ء) کے صفحہ 109 پر ایک نہایت عمدہ نظم "حادثہ" ہے رضا نے اپنی فکری صلاحیت کے عظیم جوہر کی صحت مند روایت کو یہاں بھی برقرار رکھا ہے۔ کہ وہ اپنی نظموں سے ایک انفرادی فکر کی دعوت پر قاری کی توجہ مبذول کراتے ہیں' بیان سادہ اور رواں دواں ہوتا ہے۔ جس سے قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ نظم کو ایک ہی نظر میں پڑھ تو ڈالتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے پھر سے بغور مطالعہ کرنے کے لیے رک رک کر پڑھتا ہے "حادثہ" اسی قبیل کی ایک نظم ہے' جس میں کسی ہوائی' بحری' بری یا مشینی حادثے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر جدید نظموں کا مذاق بن گیا ہے۔

رضا نے ایک عجیب حادثہ پیش کیا ہے۔ اور وہ نہایت درجہ فطری ہے۔ اور

ہر سال واقع ہوتا ہے اور اسی کی بنیاد پر بہاروں کے طوفان آتے ہیں۔ رضا کا بیان کیا ہوا "حادثہ" دیکھیے کتنا اہم ہے۔

"آج شب گلشن میں در آئی خزاں"

"خزاں کا در آنا" رضا کے نزدیک حادثہ ہے' چونکہ وہ ایک قسم کی بربادی' تباہی اور خرابی کا باعث ہے۔

دل کا پودا سوکھ کر کانٹا ہوا
سوز غم سے آشیانہ جل گیا

اور پھر اس سب کا ناقابل تردید نتیجہ یہ تیسرا مصرع۔

اوج دم بھر میں زمیں پر آ رہا

"زمیں پر آ رہا" سے جو زوالی کیفیت کا بیان مقصود ہے۔ اس کا جواب مشکل ہے۔ پھر فیصلہ کن بات یہ کہ۔

"ہو گئی اصل گل وغنچہ عیاں"

یعنی کہ "گل وغنچہ" دونوں کا حسن عارضی ہے۔

پھر حادثے کا لازمی نتیجہ:

باغباں کو کپکپی لگنے لگی
زندگی بے زندگی لگنے لگی
کوک کوئل کی بری لگنے لگی
کٹ گئی اہل گلستاں کی زباں
ٹھنڈے جھوکے ہوگئے دل پر گراں

باغباں کو کپکپی' یعنی وہ ٹھٹرنے لگا ہے۔ ذہن ماؤف ہے اور "زندگی بے زندگی" کا ثبوت یہ کتنی نفسیاتی بات ہے کہ "کوک کوئل کی بری لگنے لگی" اس سے بڑھ کر اور کیا خرابی ہو سکتی ہے۔ رضا نے ایک اور کیفیت اس حادثے کے موضوع کی یہ بیان کی ہے۔

"کٹ گئی اہل گلستاں کی زباں"

یعنی کوئی اس حادثے پر کچھ کہہ ہی نہیں سکتا' گویا خرابی اور بے بسی' نرم نرم ہوا کے جھونکے جو فرحت بخش ہوتے ہیں' وہ بھی دل پر گراں ہو گئے ہیں' ہائے رے حدثہ کی بربادی کا احساس' اب اس حادثہ خزاں کی تصویر کاری پر فدا ہو جایئے۔

"سبز پتے تیز خنجر ہو گئے"

اس سے بد تر کیفیت ملاحظہ کیجئے۔

"پھول کانٹوں سے بھی بد تر ہو گئے"

نرم سے نرم چیز پتھر دل پر محسوس ہونے لگی۔ رنگ آسماں میں تبدیل ہو جانا ہی سب سے بڑی خرابی ہے۔ جو "حادثہ" کا اہم نتیجہ ہے۔ ان تمام اشیاء کی ماہیت پر بہ نظر غور دیکھیے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ رضا نے خزاں کو "حادثہ" قرار دے کر اس کا وقت "آج شب" اور پھر جائے حادثہ "گلشن میں" بھی متعین کر دیئے ہیں۔

وقوع حادثہ میں دو اہم نکتے قانونی طور پر جاننا ضروری ہیں۔

حادثہ کب ہوا؟ اور کہاں ہوا؟

رضا نے نظم کی ابتدا ہی اس قانونی جواب سے کر کے اپنی قانونی جانکاری کا ثبوت دیا ہے۔ ممکن ہے یہ بات اتفاقی امر ہو' لیکن قلم کی اس اتفاقی صورت سے ان کی محتاط نظم نگاری کا ثبوت فراہم ہوتا ہے' مجھے چونکہ رضا کی خدمت میں مسلسل گھنٹوں رہ کر ان سے تبادہ خیالات کا موقع ملا تھا۔ اس لیے میں ڈنکے کی چوٹ پر کہہ سکتا ہوں کہ رضا نے اس نظم میں جہاں اپنی فکر کی منفرد شخصیت کا عکس پیش کیا ہے' اس سے ان کی طبع کی سرشت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عام روش سے بچ کر شعر کہتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ انہوں نے یہ نظم ایک ہی نشست میں نیروبی (مشرقی افریقہ) میں اپنے دفتر میں بیٹھے بیٹھے کہہ لی تھی۔ دفتری کاموں کے الجھاؤ میں رہ کر اس طرح کی نظم کو مکمل روپ دینا عام مشق اور فکر کا کام نہیں ہے۔

انسانی زندگی حادثات سے بھری ہوئی ہے۔ لمحہ لمحہ حادثات واقع ہوتے ہیں۔ ہم انہی حادثات سے اپنے کو دو چار ہوتے ہر وقت دیکھتے ہیں۔ اب حادثات دیکھنے کی عام عادت اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ ادھر رخ بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ نہ دل پر کوئی

خاص اثر ہوتا ہے' نہ کہیں ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے' عام بات کی طرح بڑے سے بڑا حادثہ نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ تساہل پسندی اور قانون سے روگردانی حادثات کے دو اہم اسباب قرار دیئے گئے ہیں۔ ایک سرکاری سروے رپورٹ کے مطابق 95 فیصد حادثات انہیں دو اسباب کی بنا پر واقع ہوتے ہیں۔

رضا نے جو "حادثہ" پیش کیا ہے وہ خالص ان کے ذہن کی اپج کا غماز ہے۔ لیکن اس پر غور کیجیے تو یہ حادثہ نہ صرف فطری طور پر لازمی بلکہ ایک خاص تعمیری طرز کا حامل ہے۔ پھر اس میں گلشن کے پتوں اور باغباں کی ذہنی کیفیت کی جو تصویر کشی کی گئی ہے' وہ دراصل ایک سادہ سے گلشن کی آڑ میں "گلشن ہستی" کی طرف بلیغ اشارہ ہے۔ اس "حادثہ" کے بعد ہی "گلشن ہستی" "گلشن ایجاد" بن جاتا ہے۔

رضا نے گلشن ہستی کو گلشن ایجاد میں تبدیل ہونے کے معاملے کو "حادثہ" کا رنگ دے کر اسے ایک نئے خیال سے ہم آہنگ کرکے شریک ادبیات کیا ہے۔

(3) لاوارث:۔

تیسرے مجموعہ کلام "شاخ گل" (مطبوعہ 1974ء) کے صفحہ پر انسانی زندگی کے تین مختلف محاذوں کی یہ تمہیدی نظم ہے' عام خیال ہے کہ دنیا ایک سرائے فانی ہے' اور ہم سب اس کے مسافر ہیں' لیکن رضا کے نزدیک منزل پر رک جانا ایک عجیب مسئلہ کھڑا کردیتا ہے۔

"مسافر آ کے منزل پہ اچانک رک گیا کیسا....."

"یہ "مسافر" خود شاعر کی باطنی شکل میں ایک انسان ہے۔ جو "منزل" پر آکر اچانک رک جاتا ہے' مگر کیوں؟ کیا یہ "رک گیا" مستقل ٹھہرنے کی غمازی کرتا ہے؟ کاش! کوئی اس سے کہہ سکتا کہ یہ مستقل پڑاؤ نہیں ہے۔ بلکہ یہ قیام بھی سفر ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

کوئی کہہ دے.....ہے منزل دوسرا اک نام رستے کا...

رضا نے یہاں لفظ "منزل" کو مستقل ایک خاص ٹھہراؤ کے مقام کا نام دیا ہے۔ جہاں سے سفر کی تکمیل کا مقصد حل ہوتا ہے۔ اس کو رضا نے "دوسرا رستہ"

کہا ہے۔ اور اسی کا نام "منزل" قرار دیا ہے۔ یہی چلتے رہنا' ٹھہرنا پھر چلنا یہی حیات ابدی کا اصول ہے۔

دوسرے بند میں رضا نے ایک بھکاری کی تمثیل دے کر اپنی بات کو واضح کرکے قدرے ابہام پیدا کردیا ہے۔ جو عام قاری کے ذہن سے بالا ہے۔ بند دیکھیے۔

بھکاری اپنے ہی در کا سدا کرتا رہا پھیرا
کوئی تھا ہی کہاں گھر میں جو اس کو بھیک دے دیتا

رضا نے عرفان ذات سے خالی انسان کی بد قسمتی اور اس کی لازماً بد حالی کی طرف نہایت سادگی سے اشارہ کیا ہے۔ کہ انسان خود ہی اپنے کو مالا مال کرنے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ورنہ کون کسے بھیک دیتا ہے۔

اس نظم کا بالراست اثر اس کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ خود کو کافی سمجھ کر ہی اپنی ذات سے مفاد حاصل کرنے کا راستہ تلاش کرنا چاہیے۔ تیسرا بند خاصا مشکل ہے۔

مغنی وقت کے صحرا میں کھو بیٹھا ہے سر اپنا
کوئی وارث نہیں اب نا سرائیدہ ترانوں کا

رضا نے جتنی زیادہ آسان اور عام فہم انداز میں بھکاری کی تمثیل پیش کی تھی اتنی ہی مشکل یہ فیصلہ کن تمثیل "مغنی" کی پیش کی ہے۔ "وقت کو صحرا" کہہ کر رضا نے دنیا کی بے رونقی کو احساسات کی روشن آنکھوں سے دیکھا ہے' ایک مغنی جسے رضا نے دوسرے بند میں "بھکاری" کہا ہے۔ وہی ہے جو پہلے بند میں "مسافر" ہے۔ "وقت کا صحرا" بھی وہی مقام ہے۔ جہاں:

بھکاری اپنے ہی در کا سدا کرتا رہا پھیرا

یا پہلے بند میں۔

مسافر آکے منزل پہ اچانک رک گیا کیسا.....

پھر:

کوئی وارث نہیں اب ناسرائیدہ ترانوں کا

یہ بھی وہی چیز ہے جو بھکاری کی تمثیل میں:

کوئی تھا ہی کہاں گھر میں جو اس کو بھیک دے دیتا...

رضا نے دراصل یہ کہنا چاہا ہے کہ پہلے بند کا مسافر' دوسرے بند کا بھکاری اور تیسرے بند کا لاوارث دراصل ایک ہی وجود کی شناخت ہیں۔ یہ وجود لاوارث اس لیے ہے کہ کوئی نہیں ہے جو اس کے "ان گائے ہوئے" گیتوں کو "گائے ہوئے" گیتوں میں تبدیل کرسکے۔ یہ ناسرائیدہ ترانے اس کی اساس ذات ہیں۔ اور کوئی ان کا وارث نہیں ہوسکتا۔

ہر شخص کی اپنی جو بھی صلاحیت ہوتی ہے' اس کا کوئی وارث نہیں بن پاتا..... انسان ایسی بے بسی اور بے چارگی کی حالت کا پیکر ہے' جو قطعاً "لاوارث" اس جہان سے جاتا ہے۔

رضا کی یہ اچھوتی فکر ہے کہ وہ عام انسان کے لیے ایسی فکر انگیز بات کہہ بیٹھتے ہیں' جس سے اتفاق مشکل سہی لیکن اس سے انکار بھی آسان نہیں' کیونکہ وہ ایک خاص فکر کو دعوت دیتے ہیں' انسان کی حیات کے بے ثبات ہونے کی بنیاد پر اسے "مسافر" تو بہت طرح کہا گیا ہے لیکن اسے "بھکاری" اور "مغنی" کی تمثیلات کا لباس شاید ہی کسی شاعر نے پہنایا ہو۔

ان تینوں نظموں میں لہجہ کی مضبوطی بہت ہے' اور ایک روشندان کا سا اندھیرا ہے۔ جو کرب لیے ہوئے نہیں ہے۔ بلکہ اس کے عقب میں چھپتا ہوا ایسا نور ہے جو تاریکی بدوش ہے' یہ تہہ داری ایک خاص قسم کی سنجیدگی سے عبارت ہے' جس نے بیان کی سادگی کے باوجود نفس مضمون کو عام فہم نہیں ہونے دیا۔

پختہ اسلوب بیان' سنجیدہ مشاہدہ' الفاظ کی نرم روی و آہستگی اور رواں دواں بے تکلفی نے رضا کی ان تینوں نظموں میں قاری کو قربت بخشی ہے۔

میرے کلام پر چند اصلاحیں

مترنکودری ( ) میرے دادا استاد قبلہ جوش ملسیانی کے ارشد تلامذہ ہی میں نہیں بلکہ ایک باخبر شاعر اور عمدہ نثر نگار بھی ہیں۔ انہوں نے ماہر نالوی مرحوم(۲) (جنہیں کسی زمانے میں جوش صاحب کا جانشیں کہا جانے لگا تھا) کی ایک نظم "عالم بہار" محترمی رضا صاحب کو بھیجی۔ رضا صاحب نے اس چودہ شعری نظم کے اکثر شعروں میں ترمیم کرکے نظم جناب مترنکودری کو واپس بھیج دی۔ مترصاحب اپنے خط مورخہ 28 مارچ 1997ء میں لکھتے ہیں:

"نظم پر آپ کا مشورہ (اصلاح کو مشورہ ہی لکھ رہا ہوں) آپ کے کمال فن کا مظہر ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا سقم بھی آپ کی نظر سے بچ نہیں سکتا۔ آپ نے بہت باریک بیں نظر پائی ہے۔ اصلاح کے ایک ایک لفظ کو بار بار پڑھا اور غور کیا۔ واقعی اصلاح کا حق ادا کردیا۔ کہیں اختلاف کی گنجائش نہیں۔ اصلاح کے بعد نظم کا حسن بڑھ گیا ہے۔"

یہ کاغذ میری نظر سے گزرا ہے اور سچ یہ ہے اسی نظم کی اصلاحات نے مجھے اس مضمون کے قلم بند کرنے کی طرف راغب کیا۔ چند اشعار مع اصلاح لکھے جاتے ہیں توجہی اشارے بھی جو رضا صاحب نے ترمیم کے بعد لکھے تھے درج کردیئے گئے ہیں:

بڑھ گیا حسن کا بھی شوق ظہور　　بڑھ گیا حسن کا بھی شوق نمود
عشق کے ذوق جستجو کی طرح　　عشق کے درد جستجو کی طرح

توجیہ: عشق اور ذوق ہم معنی لفظ ہیں۔ یہاں جستجو بھی بے ربط ہی ہے مگر

(رہنے دیا ہے کیونکہ) قافیہ ہے۔

اللہ اللہ رے اہتمام بہار　　رنگ بھی اڑ رہا ہے بو کی طرح
اللہ اللہ رے پیش رفت بہار　　رنگ بھی اڑ رہا ہے بو کی طرح

توجیہ: اہتمام کا کیا تک ہے؟

محو سجدہ ہے سبزہ گلشن　　عاشقان نیاز خو کی طرح
محو سجدہ ہیں سبزہ ہائے چمن　　عاشقان نیاز خو کی طرح

توجیہ: سبزہ واحد کے ساتھ عاشقان جمع کی تشبیہ معیوب ہے۔

بال کھولے ہیں اپنے سنبل نے　　شاہدان دراز مو کی طرح
بال کھولے ہیں سرو و سنبل نے　　شاہدان دراز مو کی طرح

توجیہ: سرو و سنبل، شاہدان ہو سکتے ہیں۔ سنبل واحد شاہداں جمع

شرر افشاں ہے شعلہ گل بھی　　بلبل آتشیں گلو کی طرح
شرر افشاں ہے نغمہ گل بھی　　بلبل آتشیں گلو کی طرح

توجیہہ: شعلہ تو شرر افشاں ہی ہوگا۔ آتشیں گلو کا جواز کیا ہے؟

باغ کو دیکھ کر کسی کی یاد　　دل پہ چھائی ہے رنگ و بو کی طرح
باغ میں آ کے آج ان کی یاد　　چھا گئی دل پہ رنگ و بو کی طرح

توجیہ: شعر کو ترقی دینے کے لیے ترمیم کی گئی۔

اشک افشاں ہے میرا دیدہ تر　　ہو بہو ابر گریہ خوں کی طرح
اشک افشاں ہے میرا دیدہ غم　　آج کل ابر گریہ خوں کی طرح

توجیہ: دیدہ تر تو اشک فشاں ہوتا ہی ہے، اشک فشانی کی وجہ کیا ہے؟ ہو بہو کے ساتھ کی طرح کیونکر آئے گا (کی طرح کو تو نکالا نہیں جا سکتا کیونکہ ردیف ہے اس لیے ہو بہو کو بدل دیا) ہو بہو قطعیت کے ساتھ آتا ہے، جیسے ہو بہو وہی (ہو بہو اس طرح ہے درست نہیں)۔

قارئین درج بالا چند ترامیم سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ رضا صاحب کی نظر کتنی گہری ہے۔ میرے کلام کو بھی اکثر انہوں نے اسی طرح سے دیکھا ہے۔ میرے پاس اصلاحیں تو بہت سی ہیں مگر میں جو چند اصلاحیں ذیل میں پیش کر رہا ہوں وہ ایک خاص مقصد کے لیے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ فن اور مزاج زبان وبیان کے جاننے کے خواہش مند بھی مستفید ہو سکیں۔

محترمی رضا صاحب کسی کو اپنا شاگرد نہیں کہتے' دوست کہتے ہیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان کے فیضان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کے کم از کم پندرہ شاگرد ہیں جو ان سے باقاعدہ اصلاح لیتے ہیں اور بے قاعدہ اصلاح لینے والے تو بیسیوں ہوں گے۔ دسیوں مشہور شاعر (مدت سے مشہور اور نو مشہور) اپنے پورے کے پورے مجموعہ ہائے کلام ان سے اصلاح کروا چکے ہیں' اگرچہ ان میں سے بیشتر کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اپنے مطبوعہ مجموعوں میں کہیں رضا صاحب کا شکریہ ہی ادا کردیں۔ اگرچہ رضا صاحب نے کبھی اس کی خواہش نہیں کی تاہم فیض پانے والے کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس بات کا اقرار کرے۔ میں جانتا ہوں کہ رضا صاحب میری اس بات کو پسند نہیں کریں گے مگر میں اپنی اس جھنجلاہٹ کو چھپانے سے معذور ہوں۔ لیجئے اب اصلاحیں پیش خدمت ہیں۔

جانے نقصان یہ کتنی جانوں کا ہے
رنگ خوں کی طرح آسمانوں کا ہے

جانے نقصان یہ کتنی جانوں کا ہے
جو لہو کا سا رنگ آسمانوں کا ہے

وجہ اصلاح: خون اردو میں اعلان نون کے بغیر فصیح نہیں۔

جانے کی جگہ فصیح تو خدا جانے یا نہ جانے ہی ہے مگر آج کل شعراء جانے استعمال کرنے لگے ہیں اس لیے رہنے دیا ہے۔

اٹھ رہی ہیں ترے نام پر انگلیاں

شہر میں چرچا تیرے بیانوں کا

اٹھ رہی ہیں ترے نام پر انگلیاں
شہر میں ذکر تیرے بیانوں کا

وجہ اصلاح: چرچا کا الف گر رہا ہے۔

وہ آگئے تو سہمے ہوئے سارے سو گئے
جلتا چراغ اک بھی سر انجمن نہ تھا

وہ آگئے تو جیسے زمانہ ہی سو گیا
روشن کوئی چراغ سر انجمن نہ تھا

وجہ اصلاح: جلتا چراغ.......... نہ تھا میں بھونڈی تعقید ہے۔

تیرے ملن کے بعد ہی رستہ سنور گیا
ہم آسماں پہ اس دفعہ بے بال و پر گئے

تو کیا ملا کہ شہپر پرواز مل گیا
ہم آسماں پہ اس دفعہ بے بال و پر گئے

وجہ اصلاح: پہلا مصرع بے جوڑ تھا۔ دفعہ' نوبت اور باری کے معنوں میں بروزن وفا ہی آتا ہے بروزن فاع نہیں۔ جیسے:

لبوں تک آہ کے ہمراہ جان زار آئی
یہ آئی لاکھ دفعہ وہ بھی لاکھ بار آئی
(شوق قدوائی)

میں تھا بد نام' زمانے میں ازل سے لیکن
ہو کے رسوا بھی میں مشہور ہوا ہوں کتنا

میں تھا بدنام' زمانے میں ازل سے لیکن
لاکھ رسوا سہی مشہور ہوا ہوں کتنا

وجہ اصلاح: از ساحر۔ اصلاح کے بعد شعر کی چستی ظاہر ہے۔ دونوں مصرعوں میں میں ناگوار گزرتا ہے۔

یہ تجربہ ہے، ہوا مجھ کو شہر میں رہ کر
یہاں کے لوگ کبھی دوستی نہیں کرتے

تمہارے شہر میں رہ کر یہی کھلا مجھ پر
یہاں کے لوگ کبھی دوستی نہیں کرتے

وجہ اصلاح: مضمون وہی ہے مگر اصلاح کے بعد صاف ہوگیا ہے۔ ہے ہوا میں عیب تناخر ہے۔

سب زبانوں کی ہے مٹھاس اس میں
بس یہی اک کمال اردو ہے

سب زبانوں کی ہے مٹھاس اس میں
بس یہی تو کمال اردو ہے

وجہ اصلاح: بس اور اک یہاں ہم معنی ہیں اس لیے حشو۔

گاہ کرتوتوں کا سب یہ دوش ہے
کس کو جیون میں یہاں سنتوش ہے

کالے کرتوتوں کا سب یہ دوش ہے
کس کو جیون میں یہاں سنتوش ہے

وجہ اصلاح: کرتوت کو اہل پنجاب مونث بولتے ہیں۔ ویسے مذکر اور مونث دونوں طرح معنی نکالا جاتا ہے مگر ترجیح مذکر کو ہے۔

نئے اجالوں کے متوالوں چندا پر پہنچے ہو اگر
روشنی اگنی سے نکلی ہے مت کھیلو جل جاؤ گے

تازہ اجالوں کے متوالوں چندا پر پہنچے ہو اگر

روشنی اگنی سے نکلی ہے مت کھیلو جل جاؤ گے

وجہ اصلاح: نئے اس وزن کے شروع میں نہیں آسکتا۔ مت رہنے دیا ہے کیونکہ میں اب اسے متروک نہیں سمجھتا۔

چھاؤں سے میری ڈرتے ہو اب سے مگر وہ دور نہیں
میں جاؤں گا جہاں بھی میرے پیچھے پیچھے آؤ گے

میری چھاؤں سے ڈرتے ہو اب وقت مگر وہ دور نہیں
میں جاؤں گا جہاں بھی میرے پیچھے پیچھے آؤ گے

وجہ اصلاح: دونوں مصرعوں میں سے اور جہاں کا وزن اس بحر میں جائز نہیں۔

آغاز خوش رہے گا تو انجام بھی ہو خوش
کرنے دے تیرے نام ہی سے ابتدا مجھے

آغاز خوش رہے گا تو انجام بھی ہو خوش
کرنے دے اپنے نام ہی سے ابتدا مجھے

وجہ اصلاح: تیرے کی جگہ اپنے صحیح زبان ہے۔

کلی کا حسن چمن کا نکھار چھین لیا
یہ کس نے دل کا ہمارے قرار چھین لیا

کلی کا حسن چمن کا نکھار چھین لیا
نہ جانے کس نے ہمارا قرار چھین لیا

وجہ اصلاح: شعر رواں ہوگیا۔

اعتراف گناہ یہی تو ہے
شرم سے ایک بار مر دیکھو

ہے یہیں لطف اعتراف گناہ
شرم سے ایک بار مر دیکھو

وجہ اصلاح: وجہ اصلاح ظاہر ہے۔

پھول صحرا میں کھل گیا ساحر
آج انساں کو چاند پر دیکھو

پھول صحرا میں کھل گیا جیسے
ساحر انساں کو چاند پر دیکھو

وجہ اصلاح: از ساحر۔ دو لفظوں کے رد وبدل نے شعر کا رنگ ڈھنگ ہی بدل دیا ہے۔

پھول بھی اب مجھے چبھتے نظر آتے ہیں
کانٹوں تک سے بھی شکایت کبھی پہلے نہ ہوئی

پھول بھی اب مجھے چبھتے نظر آتے ہیں
کانٹوں تک سے یہ شکایت کبھی پہلے نہ ہوئی

وجہ اصلاح: مصرعہ ثانی میں بھی اور کبھی ایک ساتھ غیر فصیح۔

بھیگی ہوئی زلفوں کو شانوں پہ بکھیرنے دو
بادل کو برسنے دو سورج کو نکھرنے دو

بھیگی ہوئی زلفوں کو شانوں پہ سنورنے دو
بادل کو برسنے دو سورج کو نکھرنے دو

وجہ اصلاح: چونکہ قافیے بھرنے' اترنے ہیں اس لیے مطلع میں بکھیرنے' نکھرنے قوافی رکھنے سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ پوری غزل میں ایسے ہی قافیے ہوں گے۔

پھر گئی یک بیک یہ مت کیسی
وہ بلانے لگے قریب ہمیں

پھر یک بیک دل بدل گیا کیسا
وہ بلانے لگے قریب ہمیں

وجہ اصلاح: پھر جانا کے معنی دشمن یا مخالف ہو جانا کے بھی ہیں۔

ہزاروں منزلیں دشوار ملتی ہیں تیرے در تک
تیرے دیدار کی حسرت میں لیکن ہر سزا اچھی

ہزاروں مرحلے حائل میرے در سے تیرے در تک
تیرے دیدار کی حسرت میں لیکن ہر سزا اچھی

وجہ اصلاح: منزلیں دشوار ملنا بھی تعقید ہے اور مصرعہ بھی مفہوم کے لحاظ سے ادھورا ہے۔

اب تو ان کی بھی آرزو نہ رہی
دل کے حالات کچھ عجیب ہوئے

آرزو کی بھی آرزو نہ رہی
اپنے حالات کچھ عجیب ہوئے

وجہ اصلاح: پہلا مصرعہ بھی چست ہو گیا اور دل کے حالات کی مغائرت بھی نکل گئی۔

کیف سے روح جھوم اٹھی ہے
کس ادا سے کیا سلام نہ پوچھ

روح کیا جھوم جھوم اٹھی ہے
کس ادا سے کیا سلام نہ پوچھ

وجہ اصلاح: کیف سے کا ٹکڑا بھرتی کا ہے۔

اس مختصر مضمون کو اپنے اس مقطع پر ختم کرتا ہوں۔

ساحر تیرے کلام میں پرتو اسی کا ہے
اصلاح سے یہ ربط ہوا ہے رضا کے ساتھ

کچھ برجستہ اشعار

آج رضا صاحب اردو ادب کے ستونوں میں سے گنے جاتے ہیں اور یہ بیشتر ان کے تحقیقی کارناموں کی وجہ سے ہے۔ لیکن تحقیق محض گڑے مردوں کو اکھاڑ کر قطار میں لا کھڑا کرنے کا نام نہیں۔ تحقیق کے معنی حق کی تلاش کرنا ہیں' اور تلاش حق کے لیے صرف صبر آزما محنت اور مشقت ہی لازم نہیں بلکہ بے پناہ وسعت علم و آگہی بھی ضروری ہیں۔ رضا صاحب میں یہ گن بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کا علم عروض پر ایک عمیق و عریض مقالہ "خزم" کے عنوان سے پڑھا۔ یہ علم اور یہ خزم و احتیاط جس شخص کے پاس ہے اسے صرف ماہر غالبیات کہہ کر دل کو تسلی دے لینا یقیناً" تصویر کا محض ایک گوشہ دکھا دینا ہے۔ اسی سوچ کا اثر ہے کہ رضا صاحب کی شاعری پر پردے پڑنے شروع ہوگئے اور وہ خود بھی بیش از بیش نثر ہی لکھنے لگے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اولاً" شاعر تھے اور اب وہ اولاً" نہ سہی مگر صف اول کے شاعر ضرور ہیں۔ انہوں نے فن شعر مشہور استاد ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی مرحوم تلمیذ جہاں استاد داغ دہلوی سے حاصل کیا اور پھر اپنی عطاؤں سے مجھ ایسے بیسیوں کو فن شعر سے آگاہ کیا۔

اکتوبر 1968ء میں رضا صاحب کا اولین شعری مجموعہ "شعلہ خاموش" چھپ کر مشرقی افریقہ کے ملک کینیا کی راجدھانی نیروبی پہنچا۔ مجھے ٹیلیفون ملا اور حکم ہوا کہ اپنے حصے کی کتاب لے جاؤ۔ میں ان کے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ "شعلہ خاموش" کی چند جلدیں پڑی تھیں۔ ایک جلد مقامی علم دوست اور شاعر جناب عبدالرحمٰن بزمی کے نام تھی اس پر رضا صاحب نے یہ قطعہ لکھ رکھا تھا مجھے یقین ہے کہ یہ فی

البدیہہ ہی کہا ہوگا۔

دوستوں پر ٹھونسئے اپنا کلام بے کمال
اس طرح راہ سخن میں ان کو رہبر کیجئے
بزمی بالغ نظر کو دیجئے دیواں، رضا!
"شعلہ خاموش" نذر "شعلہ پرور" کیجئے

میں نے عرض کیا کہ میرے لیے بھی کچھ منظوم عنایت فرمائیں۔ رضا صاحب نے ایک جلد اٹھائی اور اس پر ایک آدھ لمحے کے وقفے کے بعد تحریر فرمادیا۔

ایک دیوان جس میں فن نہ زبان
چند اوراق جن میں عقل نہ ہوش
ساحر خوش خیال و خوش خو کو
پیش کرتا ہوں "شعلہ خاموش"

میں اس بدیہہ گوئی پر حیران رہ گیا۔ میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ بدیہہ گوئی کا ملکہ انہیں قدرت کی طرف سے لڑکپن ہی سے عطا ہو چکا تھا۔ فرمایا کہ "کوئی پندرہ سال کا تھا کہ میرے گاؤں کے ایک نوجوان شادی لال نے سوڈا واٹر کی مشین لگائی۔ میں تھا فطرتاً" شرمیلا مگر یہاں وہاں فی البدیہہ اشعار کہہ کر بعض دوستوں کو سناتا رہتا تھا۔ اسی لیے شادی لال نے درخواست کی کہ میں ایک نظم اس کے لیے بھی کہہ دوں۔ چنانچہ ذیل کی نظم میں نے وہیں دکان پر بیٹھے بیٹھے فی البدیہہ کہی تھی جو اس نے خوش خط لکھوا کر اپنی دکان پر آویزاں کرلی تھی اور وہ وہاں مدتوں رہی۔

شادی لال کا سوڈا

جزاک اللہ دنیا میں عجب ہی چیز ہے سوڈا
تپش میں گرمیوں میں سورگ کی دہلیز ہے سوڈا
اگر جلتا ہے جسم اپنا تپش اور لو کی کثرت سے
تو ڈالو برف لیمونیڈ میں اور پی لو عشرت سے
اگر ہے زور گرمی کا بخار آتا ہے انساں کو

تو پی لو دودھ میں تسکین دو جسم پریشاں کو
بہت قسمیں ہیں سوڈے کی، نہیں بس ایک لیمن پر
پپو ومٹو، خس، آم اور رس بھری، کیلا، ملک، جنجر
سلکھڑی یا کوئی ہو اور آمیزش نہیں ایسا
دکاں ہے دھرم وایماں کی، بٹورے گی نہیں پیسا
جو حاسد ہے مقابل آئے سوڈا دیکھ کر بولے
اگر ہو نقص اس میں تو کہے جو کچھ وہی کچھ لے
ترقی کرچکا کتنا زمانہ حال کا سوڈا
یہ پیاسو! آزماؤ پی کے شادی لال کا سوڈا

بقول رضا صاحب انہی دنوں ان کے دوست ہنس راج کی شادی ہوئی۔ برات جس گاؤں گئی تھی وہاں ایک شاعر بھی تھے جن کا پیشہ سہرا گوئی تھا۔ سہرے تو غالباً شاعر کے پاس دو ایک ہی ہوں گے مگر حضرت شاعران میں نام بدل کر اور نیا کلام کہہ کر سناتے رہتے تھے۔ اس طرح ان کی روزی روٹی چلتی تھی۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا۔ رضا صاحب نے تڑاق سے کہا کہ ہنس راج کا نام مصرع میں ٹھیک طرح سے نہیں بندھا۔۔ شاعر صاحب آپے سے باہر ہوگئے اور فرمایا کہ آپ ایک مصرعہ تو کہہ کر دکھائیں۔ انہوں نے فوراً پانچ چھ شعر کا سہرا کہہ دیا۔ رضا صاحب نے چار شعر جو انہیں یاد تھے سنائے۔

سہرا

سجا ہے ہنس راج اس طور سر پر باندھ کر سہرا
کہ سر سے پاؤں تک معلوم ہوتا ہے دگر سہرا
تڑپ اٹھتے ہیں لاکھوں ناز جب سہرا جھلکتا ہے
کہ غمگیں دل میں بھی ٹھہرا ہوا ہے کرکے گھر سہرا
یہ سایہ چاند کا تالاب کے شفاف پانی میں

یہاک تارا' بنا جو آسماں سے ٹوٹ کر سہرا
رہے دولہا دلہن کے پریم میں وہ ہر قدم شامل
جو کالی داس نے جلدی میں باندھا مختصر سہرا

رضا صاحب نے فرمایا کہ استاذی قبلہ جوش ملسیانی کا مجموعہ کلام "بادہ سرجوش" چھپا اور انہیں 1941ء میں ملا۔ وہ ابھی ان کے شاگرد نہیں ہوئے تھے' مگر ان کے مداح تھے۔ رضا صاحب کے پاس تھوڑا سا غیر اصلاح شدہ کلام جمع ہوگیا۔ انہیں شوق چرایا کہ وہ بھی اپنا دیوان مرتب کریں۔ دیوانگی میں سب کچھ ممکن ہے۔ انہوں نے اس کا نام "راز رضا" رکھا اور شام کو اپنے گاؤں کے قاضی سید احمد علی صاحب سے (جو نہایت شریف اور ملنسار انسان تھے) ذکر کیا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ نام تو اچھا ہے مگر شروع میں کوئی قطعہ تو ہونا چاہئے اور اگر فارسی میں ہو (وہ فارسی کے بڑے دلدادہ تھے) تو اچھا ہے۔ رضا صاحب نے فوراً یہ قطعہ فکر کردیا۔

اے کہ تو بخشندہ جور و جفا
اے کہ تو رنگریز تن زیب ذکا
تو مرا از بحر معنی بیروں کن
اے خدا! مقبول کن "راز رضا"

فرماتے تھے "بلحاظ زبان یہ فارسی نا درست سہی' رنگریز کا تلفظ غلط سہی' مگر یہ صحیح ہے کہ قاضی صاحب پر میری فارسی دانی کا سکہ بیٹھ گیا۔"

کنول ہوشیار پوری مرحوم (مشہور جدید شاعر پروین کمار اشک کے والد محترم) رضا صاحب کے بھانجے تھے۔ ایک دفعہ آپ (شاید 1942ء میں) کنول صاحب کے گھر پٹھان کوٹ گئے۔ دیکھا کنول صاحب کسی شعر میں الجھے ہوئے پلنگ پر اوندھے منہ پڑے ہیں۔ رضا صاحب کے پوچھنے پر کہنے لگے۔ "شاعری بڑی مشکل چیز ہے ایک ہی شعر پر پہر بھر سے اٹکا ہوا ہوں۔" رضا صاحب نے چھوٹتے ہی کہا۔

کیوں ہے مشکل شاعری تیرے لیے
شاعروں کی ہمسری تیرے لیے

اٹھ کنول! غمگیں کیوں ہے؟ شاد ہو
شعر ہے گویا ہنسی تیرے لیے

رضا صاحب نے چند واقعے اور بتائے۔ "غالباً" 1944ء کی بات ہے کہ ہمارے گاؤں میں لاج پت سنگھ چودھری ڈی۔ایس۔پی (ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس) کی شان میں جلسہ ہوا۔ ہمارے اسکول کے منیجر ماسٹر بھگت رام پیش پیش تھے۔ میرے والد پکے نیشنلسٹ تھے۔ وہ اس جلسے میں کیونکر شریک ہو سکتے تھے انہوں نے تو اس جلسے کا شدومد سے بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ ہم نوجوان تھے لہٰذا جلسے کا تماشا کیئے بغیر نہ رہ سکے۔ ماسٹر بھگت رام نے جب مجھے دیکھا تو حکم دیا کہ مدحیہ نظم کہہ کر جلسے میں پڑھو۔ میں نے فوراً" وہیں چند اشعار کی ایک نظم کہہ لی' مگر ڈر کے مارے خود نہیں پڑھی بلکہ اردو کے ماسٹر بوجھا رام نے پڑھ کر سنائی اور داد حاصل کی۔ یہ سب کچھ آدھ پون گھنٹے ہی میں ہوگیا۔ ٹوٹے پھوٹے اشعار جو یاد ہیں' پیش کرتا ہوں۔

لاج پت سنگھ چودھری ڈی. ایس. پی میں
جتنے گن ہیں کس طرح ان کو گنیں

خوبصورت خوب سیرت' خوش گلو
آپ میں بالکل نہیں عہدے کی بو

دوستدار' انصاف کن نفرت سے دور
آپ کے چہرے پہ ہے عزت کا نور

مفلس وبے زر' فقیر اور ڈوم کو
وقف ہے وقت آپ کا مظلوم کو

اپنے فن کے پورے ماہر کام کے
مستحق ہیں آپ ہر انعام کے

عالموں کی قدر دانی میں ہیں خوش
دشمن افلاس ظلم وجبر کش

گونجتا ہے آپ کا ضلعے میں نام
آپ ہی کے کام کی ہے دھوم دھام

آپ کا احسان ہے ہر شخص پر
آپ کے تابع ہیں سب شوریدہ سر

مدح خواں ہے، گو نہیں یاں پر رضا
لاجپت سنگھ چودھری ڈی. ایس. پی کا

جناب کنور بچنت(۱) رام عیش کرنانوی نے 1945ء کی شام کو بنگلہ شہر(۲) میں "بسنت" کا رنگا رنگ پروگرام رکھا۔ تقریباً" 2 بجے دوپہر ایک شخص سائیکل پر میرے نام عیش صاحب کا حکم نامہ برائے شمولیت لے کر آیا۔ دیش بھگتی کا زور تھا۔ میرے والد کی ہدایت تھی کہ کوئی جشن نہ منایا جائے۔ چنانچہ میں نے اسی رقعہ کی پشت پر اسی وقت چند منٹوں میں ذیل کے اشعار لکھ کر بھیج دیئے۔

جناب عیش! پڑھا رقعہ آپ کا میں نے
بسنت کے لیے تاکید جس میں لکھی ہے

جواب میں تو بس اتنا ہی عرض کرتا ہوں
کہ ایک کام پہ جانا میرا ضروری ہے

منا تو لیتے ہی ہیں ہم ہر ایک جشن، مگر
ہمارے جشنوں کی بنیاد میں غلامی ہے

ہمارے چہرے پہ چھایا ہوا بسنتی رنگ
غلام دیش کے باشندوں کی نشانی ہے

اگر غلام رہیں گے تو ہوگی بدنامی
نہ رہنا چاہیں تو عزت ہے نیک نامی

"بسنت" خوب منائیں مجھے خوشی ہے مگر

خیال رکھیئے یہ مضبوطی غلامی ہے

رضا! غلامی کا احساس ہے تو بتلائیں

کہ ہم کو جشن منانے کا کوئی حق بھی ہے"

"ہمارے گاؤں کے پنڈت مست رام پہلے لاہور میں جرنلسٹ تھے اور کسی اخبار سے وابستہ تھے۔ تقسیم ہند کے بعد جالندھر آکر انہوں نے ایک رسالہ " داستان" کے نام سے جاری کیا اور مجھے کہا کہ دو شعر سرورق کے لیے کہہ دو۔ میں نے اسی وقت یہ دو شعر کہہ دیئے جو اس ماہنامے کے سرورق پر شائع ہوا کرتے تھے۔

کہیں ہے داستانیں سب نے' تھے طرز بیاں لاکھوں

بہت سی ہوگئیں ظاہر' ہوئی ہیں بے نشاں لاکھوں

مگر وہ داستاں جو داستاں' کا حصہ بن جائے

نہ مٹنے پائے گی چاہے پلٹ جائیں زماں لاکھوں"

"ہمارے گاؤں کے سرکاری ہسپتال کے ڈاکٹر سود کے صاحبزادے مہاویر میرے دوست تھے۔ یہ فیملی ہمارے ہاں سے تبدیل ہو کر کہیں اور چلی گئی۔ وہاں سے مہاویر نے مجھے دیوالی کارڈ بھیجا۔ میں نے اسی وقت پوسٹ کارڈ پر قطعہ لکھ کر جواب روانہ کیا۔

گزرے ایام سے پھر بھر لیا دامن میں نے

پھر سے سرسبز کیا خوشیوں کا مدھوبن میں نے

یہ بظاہر تو فقط کارڈ تھا دیوالی کا

پالیے اس سے مہاویر کے درشن میں نے"

یہ واقعات تو وہ ہیں جو رضا صاحب نے میرے دریافت کرنے پر خود اپنی یادوں کے بھنڈار سے نکال کر مجھے بتائے اور ان سب کا تعلق رضا صاحب کی بیس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے کے ہے۔ اب میں آپ کو چند وہ واقعات سناتا ہوں جو میری موجودگی میں مشرقی افریقہ میں قیام کے دوران میں ظہور پذیر ہوئے۔ یہ 1955ء سے 1969ء تک پھیلے ہوئے ہیں۔

لوگ رضا صاحب کے پاس سہرے کی فرمائش لے کر اکثر آتے رہتے تھے۔ رضا صاحب کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ سہرے میں شامل کرنے کے لیے دو چار نام نوٹ کر لیا کرتے تھے اور پھر وہیں اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے پندرہ بیس منٹ میں سہرا لکھوا دیا کرتے تھے خود قلم سے لکھ کر نہیں دیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ اس طرح کام بہت جلد نپٹ جاتا ہے۔ چند ایسے ہی مواقع پر میں خود موجود تھا۔ جب وہ سہرے چھپ جاتے تھے تو میں انہیں محفوظ کر لیا کرتا تھا۔ اگر وہ صاحب قریبی دوست ہوں تو رضا صاحب شادی میں شامل ہو کر سہرا خود پڑھتے تھے ورنہ شادی بیاہ والے لوگ کسی سے پڑھوا لیتے تھے۔ ان سہروں (اور غزل) کی نقل کی اجازت نہ تھی جو رضا صاحب دوسروں کے نام سے کہہ دیتے تھے اور ایسے کلام کی تعداد بہت ہے' خیر ایک دفعہ مومن علی حیدری (مرحوم) اپنے لڑکے محسن علی کی شادی کا سہرا لکھوانے کے لیے آئے۔ رضا صاحب نے کچھ سوچ کر ذیل کا قطعہ لکھوا دیا۔

جب سر محسن پہ سہرا ضوفشاں ہونے لگا
سارا عالم حیدری پر مہرباں ہونا لگا

عصمت بے داغ جنت سے فدا ہونے لگی
ذرہ ذرہ اس زمیں کا آسماں ہونے لگا

کم ہوا زور حسد انسان کے ماحول سے
شوق ہر لحظہ رگ جاں میں جواں ہونے لگا

یہ ہوا بندھنے لگی اس گھر کی سہرے کے سبب
ہر عداوت ، محبت کا گماں ہونے لگا

اے رضا کہہ بھی چکو قطعہ مبارک باد کا
ہر کوئی اب تو تمہارا ہمزباں ہونے لگا

اور مطمئن ہو گئے۔ حیدری صاحب نے احتجاجاً" کہا "سہرا کہاں ہے؟" رضا صاحب بولے "! چھا سہرا بھی کہنا ہے۔" انہوں نے فوراً" قطعے کا آخری شعر (مقطع)

منسوخ کرکے نیا مقطع لکھوادیا اور پھر ذرا سوچ سوچ کر پورا سہرا مکمل کرادیا۔ ملاحظہ فرمایئے۔

اے رضا ہیں اہل محفل دم بخود سہرا پڑھو
ہر طرف اب عہد سہرے کا جواں ہونے لگا۔

سہرا

مدبر و ہوشمند سہرا معزز و دل پسند سہرا
اگر نہ محسن علی پہ ڈالے تو کس پہ ڈالے کمند سہرا

اسیر احکام وضع داری شعور کا پائے بند سہرا
لبھائے دل کو حسین بن کر، کرے نظر کو دو چند سہرا

نہیں اگر حکم حیدری یہ تو آج کیونکر قلم سے نکلا
امیر کو بھی پسند سہرا غریب کو بھی پسند سہرا

تلاش محبوب میں چلا ہے دعائے عصمت ماب لے کر
جمال میں جیسے حورو غلماں مٹھاس میں جیسے قند سہرا

رضا ورغبت سے جو ہوا ہے وہ ہر خوشی کا ہے پیش خیمہ
کوئی کرے لاکھ بے وفائی وفا پہ ہے کاربند سہرا

فخر بے جا میں سب سے پیچھے ہے خاکساری میں سب سے بڑھ کر
یہ زندگی کا عروج اول یہ آسماں سے بلند سہرا

ہوا ہے نوشہ اسیر الفت نتیجہ اس کا نہ جانے کیا ہے
بزرگ ہوں فکر مند تو ہوں مگر نہیں فکر مند سہرا

رضائے احقر کی یہ دعا ہے خدائے برتر کا آسرا ہو
نہ لے کسی کا عتاب سہرا نہ دے کسی کو گزند سہرا

دیکھیے کیا کھنکتے ہوئے قافیے لائے ہیں۔ سماں باندھ دیا ہے۔ یہ سہرا تو اس

تیزی سے کہہ دیا گیا تھا جیسے کوئی تحریر پڑھ رہے ہوں۔

مظہر الحق کے لیے نکلا قلم سے سہرا
کیوں نہ برسائے گا نور اپنے کرم سے سہرا

خوب ملحق ہوئے آپس میں مقیم و شبیر
سہرے کے دم سے ہیں آپ، آپ کے دم سے سہرا

ظفر الحق نے کہا کان میں شمس الحق کے
یوں لدا ہی رہے یہ جاہ و حشم سے سہرا

ہم نے گوندھا ہے اسے کہتے ہیں یہ عبداللہ
آج کس برتے پہ یوں چھپتا ہے ہم سے سہرا

کیا ہی ان پر ہے علی اور محمدؐ کا کرم
اور بھی کھلنے لگا ان کے قدم سے سہرا

زہرہ خوش اور صغیرہ بھی ہوئی ہے دلشاد
ان کے بھائی کے بندھا رب کے کرم سے سہرا

آج آ ہی تو گئی پیار کے گلشن میں بہار
کتنا مرجھا گیا تھا ہجر کے غم سے سہرا

عشق والفت کے سوا اور نہ کچھ پوچھئے اب
آج بیگانہ ہوا دیر و حرم سے سہرا

کیوں معطر نہ ہو ہر سمت مہک سے اس کی
لوٹ کر آیا ہے گلزار ارم سے سہرا

عمر بھر تازہ رہے گا یہ نہ مرجھائے گا
ایسا نکلا ہے رضا آج قلم سے سہرا

درج ذیل سہرا کہنے سے پہلے رضا صاحب نے یہ قطعہ کہا۔ جب لکھوا چکے تو

میں نے عرض کیا کہ یہ تو رباعی کے اوزان ہیں' آپ اسے رباعی کیوں نہیں کہتے۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ اس کے دوسرے اور چوتھے مصرعوں ہی میں قافیہ ردیف کا التزام ہے۔ اس لیے میں نے اسے رباعی کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

کلیوں کی نفاست کو نگہباں پایا
پھولوں کی محافظت میں چہرہ دیکھا
خوشبوئے مسرت سے فضائیں مہکیں
جگ جیت کے ماتھے پہ جو سہرا دیکھا

اس سہرے کے مقطع میں اشارہ موجود ہے کہ سہرا فی البدیہہ کہا گیا تھا۔ ملاحظہ کیجئے۔

بندھا ہے کیا سر جگ جیت سین پہ سہرا
طلائی تاروں کا قرباں سیم وزر سہرا

جواہرات محبت بکھیر دیتا ہے
جدھر بھی دیکھتا ہے آنکھ پھیر کہ سہرا

اندھیرا ہو بھی تو کیونکر ہو آج دنیا میں
ادھر تو چاند چمکتا ہے اور ادھر سہرا

ہمیشہ بنتا رہے گا ہمیں یقین ہے یہ
ضیائے شام سیہ' رونق سحر سہرا

عجب طریق سے لہرا رہا ہے لڑلیوں کو
نمود ونام کی دنیا سے بے خبر سہرا

ابھی تو دیکھا نکورو کا شہر ہی ہم نے
ابھی تو اور بھی دکھلائے گا اثر سہرا

ہر ایک دل میں بلا شک سما ہی جائے گا

کھلے گا آنکھوں میں جب آنکھیں گاڑ کر سہرا
ہیشہ مالنیں تیار ہی کیسے جائیں!
گلوں سے کلیوں سے یوں گوندھ گوندھ کر سہرا
رضا نے دیکھیے فی الفور دے دیا کہہ کر
یہ رنگ رنگ کا رنگین ہاتھ بھر سہرا

رضا صاحب سہرا کہنے میں صرف ردیف "سہرا" ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ردیف بدل کر بھی سہرے کہے ہیں۔ ذیل کے دو سہرے ردیف بدل کر کہے گئے ہیں مگر بدیہہ گوئی کے باوجود چستی و مضبوطی بندش میں فرق نہیں آیا۔

رخ انور پر ذرا دیکھو ادا سہرے کی
دن کو بھی کتنی نمایاں ہے حیا سہرے کی

کاش آسکتے یہاں آپ بھی حاجی صاحب
مانگی ہے آپ نے جنت میں دعا سہرے کی

اے مبارک ہو مبارک تجھے سہرے کا جلال
تیری کوشش سے لبوں پر ہے ثنا سہرے کی

کیوں میسر نہ زمانے کو ہو خوشبو اس کی
خود صبا ہی جو بنے راہ نما سہرے کی

آج مشتاق علی شوق میں متوالا ہوا
یہ خوشی اس کو ہے ہم سب سے سوا سہرے کی

ہٹ کے لڑیاں اسی دم لوٹ کر آجاتی ہیں
دید کی راہ میں مانع ہے حیا سہرے کی

تارے کی اوٹ میں بے تاب نگاہیں رقصاں
لوگ کہتے ہیں کہ ہے یہ بھی ادا سہرے کی

صاحب فن نہ کریں کوشش افزائش حسن
بندھ چکی آج جو بندھنی تھی ہوا سہرے کی

مجھ کو برکات الٰہی پہ بھروسا ہے رضا
شان ابھی اور بڑھائے گا خدا سہرے کی

ایضاً

آج اس شان سے کچھ پردہ اٹھا سہرے کا
کلمہ ہر پیروں جواں پڑھنے لگا سہرے کا

کچھ بھی کہہ لینے دو ہر قول بجا سہرے کا
آج تو لگتا ہے ہر رنگ بھلا سہرے کا

ظاہری طور پہ چپ چپ ہے بہت آج ظہیر
ہے مگر ذہن میں طوفان بپا سہرے کا

فخر کو فخر نہ ہو کس لیے اس شادی پر
جب کہ اب تک ہے وہی راہنما سہرے کا

کیوں ثریا کا نہ دل فرط خوشی سے اچھلے
کیوں بہن بھی نہ کرے فرض ادا سہرے کا

ساری سکھیوں کا ہے اصرار وحیدہ سے یہی
ہاں سنا تو بھی کوئی نغمہ سنا سہرے کا

سینکڑوں لڑیاں ملیں پھول گندھے رنگ ڈھلے
گرم ہر قلب میں بازار ہوا سہرے کا

زیست کی موج سی اک دوڑ گئی نبضوں میں
شہرہ اطراف میں جب پھیل گیا سہرے کا

کیوں ہمیشہ نہ رہیں دولہا دلہن کی خوشیاں
کہ محافظ ہے رضا! دست خدا سہرے کا

ایک اور سہرا دستیاب ہوگیا۔ لگے ہاتھوں اسے بھی ملاحظہ کیجئے۔ یہ بھی بدیہہ گوئی کی ایک عمدہ مثال ہے۔

چلا ہے حاکم الفت کے روبرو سہرا
اس اشتیاق میں رقصاں ہے چار سو سہرا

امیر بخش کی، حیدر کی آبرو سہرا
طلب زمانے کی، نصرت کی آرزو سہرا

چمنستان محبت سے رنگ وبو لے کر
سجا دیا سر احمد پہ خوبرو سہرا

یہ مل رہی ہیں محبت کے جوش میں لڑیاں
کہ کر رہا ہے کسی شے کی جستجو سہرا

توجہ اپنی کھنچی جارہی ہے اس کی طرف
خموش رہ کے بھی کرتا ہے گفتگو سہرا

نماز عشق پڑھائے اسے کوئی آ کر
اس انتظار میں کب سے ہے باوضو سہرا

مریض عشق کریں اب نہ فکر چارہ گری
ہے آج درد محبت کا چارہ جو سہرا

رفیق، یار، مددگار اردلی اس کے
اسی جلوس میں جائے گا کو بکو سہرا

رضا کا نغمہ نوازی سے ہے یہی مطلب

کہ اپنے دل کی کرے پوری آرزو سہرا

ان سہروں میں جو نام آئے ہیں ان کی تفصیل اب مجھے معلوم نہیں شاید رضا صاحب روشنی ڈال سکتے ہوں۔ میں ان حضرات سے یوں بھی واقف نہ تھا اور اب ربع صدی (اور بعض کے تعلق سے اس سے بھی زیادہ عرصے) کے بعد یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔ بس دعا ہے کہ وہ جو بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں خوش حال ہوں۔

بہت زمانے (شاید 1955ء) کی بات ہے کہ مصرع طرح تجویز ہوا "کریں وہ اہل محبت کو یاد کیا معنی" یاد قافیہ' کیا معنی ردیف۔ عاشق محمد عاشق نے رضا صاب سے کہا "طرح بہت مشکل ہے اور شعر تو ہوگئے مگر مطلع تو ہوتا ہی نہیں۔ رضا صاحب کہنے لگے "کیا مشکل ہے" اور فوراً" مطلع کہہ دیا۔

یہ شعر جائیں مرے بے مراد کیا معنی
جو بڑھ کے داد سے ہوں ان کی داد کیا معنی

اسی سال مدراس سے ایک ماہر تعلیم میر احمد علی (ایم۔اے' پی۔ایچ۔ڈی) نیروبی تشریف لائے۔ اور مومن علی حیدری (مرحوم) کے گھر ٹھہرے۔ حیدری صاحب نے شام کو رضا صاحب کے دولت کدے پر آکر عرض کیا کہ میر احمد علی کے نام کا سہرا کہہ دیجئے۔ رضا صاحب نے اسی وقت پانچ شعر کا یہ قطعہ لکھوا دیا۔

مجھ سے یہ کہنے لگی آج اک کلی
آئے ہیں ہندوستان سے جو ولی
کیا تجھے معلوم ہے کام آپ کا؟
اور کیوں ہے نام میر احمد علی؟
یہ کہا میں نے کہ اے گلشن کے حسن
یہ تو ہیں درس ومدراس کے ولی
ان کی مشہوری ہے کل مدراس میں

علم کی دیوی انتی کے گھر پلی
چونکہ ہیں احمد علی کی آل سے
اس لیے ہے نام "میر احمد علی"

میر احمد علی صاحب نے جنہیں اردو شاعری سے بھی شغف تھا یہ قطعہ بہت پسند کیا اور یہ جان کر متحیر ہوئے کہ قطعہ فی البدیہہ کہا گیا تھا۔ انہوں نے رضا صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب رضا صاحب' میر صاحب سے ملنے گئے تو انہوں نے کہا کی میری خواہش ہے کہ ایک بزم شعر منعقد کی جائے اور اس طرح پر غزلیں کہی جائیں۔ وہ طرح یہ تھی "فدا تھا آپ پہ جو وہ زمانہ اور سہی" زمانہ قافیہ' اور سہی ردیف۔ رضا صاحب سمجھ گئے کہ انہیں میرے قطعے اور طریق فکر میں شبہ ہے اور وہ امتحان لینا چاہتے ہیں۔ رضا صاحب نے وہیں کچھ وقفے کے بعد ایک غزل لکھوادی چند شعر یہ ہیں۔

میری نظر کو خطا کا بہانہ اور سہی
سمند شوق کو اک تازیانہ اور سہی
اک التجائے کرم ہی پہ ختم ہے درخواست
یہ وقت اور سہی یہ زمانہ اور سہی
تری عنایتوں سے بیسیوں ہوئے گھائل
سنان غم کو مرا دل نشانہ اور سہی
ہمیں ہے شعر کی افسوں طرازیوں سے غرض
تمہارا اور رضا کا ترانہ اور سہی

محمد ابراہیم پیش امام خلیل مرحوم جو 1955/56ء میں ممباسہ (کینیا) میں ٹیچر تھے' مجھے بتایا کہ جن دنوں رضا صاحب کچھ عرصے ممباسہ میں رہے تھے' "میں نے انہیں عید کے دن شام کو اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا ملازم تین بجے میرے پاس سے میرا خط لے کر روانہ ہوا اور گھنٹے بھر میں وہاں پہنچا ہوگا۔ جب پونے پانچ بجے کے

قریب وہ واپس میرے پاس آیا تو میرے ہی خط کی پشت پر رضا صاحب کی منظوم تحریر ملی۔ اب آپ اندازہ کرسکتے ہیں ان کے فکر کرنے میں رضا صاحب کو کتنا وقت لگا ہوگا۔

اخلاص پرور آپ نے جب سے دیا پیام
دعوت پہ آؤں شام کو یوم سعید پر
مسرور ہو رہا ہوں بہت اپنے آپ میں
گویا جیا ہوں آج میں ایک اس امید پر
اس شہر دور تر میں غریب الوطن ہیں ہم
کیونکر خوشی نہ ہو ہمیں آپس میں دید پر
دو چار شعر لکھے ہیں اپنے وطن سے دور
تحفہ قبول کیجئے اتنا ہی عید پر
اخلاص اور وفائیں ہیں دیندار کی دلیل
خوش حال اقربا رہیں اور خوش رہیں خلیل

ہندوستان یا پاکستان سے ایک نوجوان لڑکا بنام سید نواب نیروبی آیا۔ اس نے پانچ دن لگا تار سائیکل چلا کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ 2 جولائی 1962ء کو اس کے پانچ دن پورے ہونے والے تھے۔ حیدری صاحب بھی مبارک باد کہنے کے لیے جا رہے تھے۔ سوچا کہ رضا صاحب کو بھی ساتھ لے چلیں۔ وہ نہ گئے مگر انہوں نے کاغذ اٹھا کر دو شعر لکھ دیئے اور کہہ دیا میری طرف سے نوجوان کو سنا دینا۔

تو خوش ہے اذیت میں بھی، ہم گھر میں ہیں بے تاب
دو گھنٹے میں ہوجاتے ہیں ہم ماہی بے آب
یوں پانچ دنوں تک تیرا سائیکل کا چلانا
کیا کہنے تیرے کام کے اے سید نواب

رضا صاحب کے اولین مجموعہ کلام "شعلہ خاموش" کے صفحہ 39 پر ایک

تعارفی قطعہ شامل ہے۔ اس کے نیچے ایک نوٹ ہے کہ یہ اشعار "(....14 دسمبر 1959ء کو بزم سخن نیروبی' کینیا کے ایک مشاعرے میں پڑھے گئے.....)"

14 دسمبر سہو کتابت تھی۔ حقیقت میں یہ مشاعرہ 24 دسمبر 1959ء کو ہوا تھا۔ مقام تھا جناب عبدالرؤف سمنا کی مجسٹریٹ' کا سکونتی مکان واقع ساؤتھ سی نیروبی۔ جب مشاعرہ ختم ہوگیا تو رؤف صاحب (انتقال ہوچکا ہے) نے عرض کیا کہ رضا صاحب آپ نے میرے لیے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ رضا صاحب نے وہیں کھڑے کھڑے اس تعارفی قطعے میں' اسی قافیہ وردیف کے لحاظ سے' تین شعر کا اور اضافہ کردیا۔ ملاحظہ فرمایئے۔ مگر اس سے پہلے تعارفی قطعے کا انداز دیکھ لیجئے۔ کل شعر دس ہیں صرف پہلا اور آخری شعر دیئے جاتے ہیں۔

ہے نام کالی داس تخلص ہے رضا
سنیے سخن وری میں مرا جو ہے مرتبا
حضرت آپ اس کو تعلی نہ جانئے
جو بھی کہا ہے میں نے وہ سچا ہے ماجرا

اب اضافہ دیکھیے:

اردو کہ جو زباں مری "بزم سخن" کی ہے
اس کا کسی زباں سے نہیں ہے مقابلہ

درخواست دست بستہ مری آپ سے یہ ہے
فرصت میں اس کا کیجئے گھر میں مطالعہ

"بزم سخن" کا جو ہوا اس گھر میں انعقاد
احساں ہے حاضرین پہ عبدالرؤف کا

رضا صاحب کے دوست جے۔ایس۔چوڈھا کے بیٹے دیپک راج کا پہلا جنم دن منایا جارہا تھا۔ رضا صاحب کچھ دیر سے پہنچے اور تحفہ پیش کیا۔ بچے کے والد کہنے لگے "شعروں کا تحفہ کہاں ہے؟" یہاں تو شعر ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ رضا صاحب نے فوراً" یہ قطعہ پیش کردیا۔

ہزاروں بار آئیں روز آئیں یہ مبارک دن
رہے یہ جشن کھل اٹھے ہر اک جاندار کا چہرہ
ابھی تو ہم مناتے ہیں جنم دن ہی رضا لیکن
پڑھیں گے ہم یہیں اک روز دیپک راج کا سہرا

گورنمنٹ ہائی اسکول کے طالب علموں نے آریہ سماج' نیروبی کے سالانہ اجلاس میں قومی یکجہتی پر پروگرام رکھا۔ رضا صاحب کو تو مدعو کرنا ہی تھا۔ آپ نے شامل ہونے سے معذرت کرلی مگر ذیل کی نظم وہیں لکھ کر ان کے حوالے کردی جو بعد ازاں جلسے میں پڑھ کر سنائی گئی

آج سب بھول گئے ہیں کہ یہ مذہب کیا ہے
کیا خبر وہگورو کیا' رام ہے کیا' رب کیا ہے
لو میں اسلام ہی پر پہلے اٹھاتا ہوں قلم
جس کے بانی وپیمبر تھے محمد صلعم!
کچھ بھی کہتا پھرے انسان کو انسان حریف
پورا توحید کا پیغام ہے قرآن شریف
کون کہتا ہے چمک ہوتی نہیں ہیروں میں
ایک دنیا ہے بسی دید کی تفسیروں میں
کرشن اوتار ہوئے متھرا کے ان گوالوں میں
جن کو پیغام دیا بنسی کے سرتالوں میں
پڑھ کے گیتا کو کہے گا جو ہے حق کا جویا
کوزے میں بند حقیقت کا ہے دریا گویا
صاف اور سیدھی ہے تعلیم گرونانک کی
لازم اپنے پہ ہے تعظیم گرونانک کی
آؤ سب مذہبوں کی برکتیں اپنائیں ہم

حق کی اولاد ہیں ہم حق ہی میں مل جائیں ہم
جن بزرگوں سے بھی کچھ مل سکے ان سے لے لیں
یوں رضا! بیٹھ کے سب ایک ہی کشتی کھے لیں

رضا صاحب بے شک سنجیدہ معیاری شاعر ہیں مگر طنز و مزاح میں بھی بند نہیں ہیں۔ ان سے روز کے ملنے جلنے والے جانتے ہیں کہ وہ نجی محفلوں میں بڑے نتھرے ستھرے مذاق سے کام لیتے ہیں۔ مزاحیہ شعر کہنے پر بھی لگ بھگ وہی قدرت رکھتے ہیں جیسی سنجیدہ شاعری پر' خاص کر بدیہہ گوئی میں۔ ایک بار ایک نشست مزاحیہ شاعری کے لیے مخصوص کی گئی۔ نظمیں کہنی تھیں۔ دو طرحیں دی گئیں۔ ایک "پھر ملیں گے اگر خدا لایا" دوسری یہ شعر جسے ٹیپ کے طور پر لانا تھا "ہری ہر' ہری ہر' ہری ہر' ہری+ مری بار کیوں دیر اتنی کری۔" رضا صاحب نے مزاحیہ مشاعرے میں شامل ہونا منظور نہ کیا۔ مگر مدعو کرنے والوں کو وہیں دونوں مزاحیہ نظمیں لکھ کر دیں۔

"پھر ملیں گے اگر خدا لایا"
بگڑے عاشق نے حوصلہ کرکے
کی ملاقات رہ میں اک مس سے
اور کہا مجھ کو تجھ سے الفت ہے
رہتا ہوں رات دن ترے کوچے
سن کر اس مس نے کھول کر سینڈل
سر پر عاشق کے زور سے مارے
اور کہا بھاگ لے یہاں سے تو
خود فریب آدمی موئے کتے
دم دبا کر وہاں سے بھاگا وہ
جاتے جاتے بس اتنا فرمایا

"پھر ملیں گے اگر خدا لایا"

○

خوش نظر آئی اس کو جب بیوی
بوڑھے کا پیار سے بھر آیا جی

وہ دبے ہونٹوں یوں لگا کہنے
کتنی لگتی ہو آج تم اچھی!!

دل میں ارمان ہیں بہت دن کے
آج نکلیں گے اے مری پیاری

سن کے بولی میاں کو آ تو موئے
تو نے سمجھا ہے مجھ کو کیا لونڈی

ٹھیک کرتی ہوں تجھ کو دم بھر میں
کہہ کے اتنا' اٹھائی جب جوتی

جا چھپا بوڑھا ساتھ کے گھر میں
جاتے جاتے بس اتنا فرمایا

"پھر ملیں گے اگر خدا لایا"

ہری ہر ہری ہر ہری ہر ہری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

کسی کو ہے شیطان سے ہمسری
کسی نے گناہوں سے جھولی بھری

کسی کو ملی ظلم میں برتری
مگر یہ رہے سب سزا سے بری

ہری ہر ہری ہر ہری ہر ہری

مری بار کیوں دیر اتنی کری

کسی نے ببر شیر زخمی کیا
کسی نے کیا خون لٹھ باز کا
کسی نے کیا فیل کا فیصلہ
نہ مجھ سے کبھی فاختہ تک مری

ہری ہر ہری ہر ہری ہر ہری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

معافی ہے ہر مردم آزاد کو
بڑی بخششیں ہیں گنہگار کو
بہت راحتیں قلب زردار کو
نگہ مجھ پہ بھی ڈال دے سرسری

ہری ہر ہری ہر ہری ہر ہری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

اڑاتا ہے درویش وفرات مال
نہ دیکھا کبھی چور کو پر ملال
ہے مال حرام اہل دیں پر حلال
نہیں چلتی کیوں میری کاریگری

ہری ہر ہری ہر ہری ہر ہری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

سمگر کا بھی خون ابلتا رہا
فریبی کا سکہ بھی چلتا رہا
لٹیرا بھی غیروں پہ پلتا رہا

رہی میری شیخی دھری کی دھری

ہری ہر ہری ہر ہری ہر ہری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

○

رضا صاحب کے دولت کدے پر کچھ دوست جمع تھے۔ میں بھی تھا۔ ان کی میز پر ہندوستان سے آیا ہوا ایک اردو اخبار پڑا تھا جس میں ماڈرن غزل کے نام سے ایک غزل شائع ہوئی جس کا قافیہ ڈیٹ' ویٹ وغیرہ اور ردیف ہوا تھی۔ ہمیں یہ اسلوب پسند آیا۔ حیدر حسن آغا مرحوم (حیدری صاحب کے چھوٹے بھائی اور رضا صاحب کے چہیتے شاگرد) کہنے لگے "رضا صاحب!۔۔۔۔۔ ایک مطلع تو ہو ہی جائے۔" رضا صاحب نے اسی زمین میں اسی وقت مطلع کہہ دیا اور تھوڑے توقف کے بعد پوری غزل کہہ دی۔ آپ بھی لطف لیجئے۔

غلام بن کے جیا جو' کبھی نہ لیٹ ہوا
وہی زمانے کی نظروں میں اپ ٹو ڈیٹ ہوا

کچھ اس طرح سے نظام حیات بدلا ہے
جو کل تھا آرڈینری آج وہ گریٹ ہوا

غریب کہہ دے اگر کوئی لفظ تو وہ ثقیل
امیر اسی کو جو کہہ دے تو ڈیلی کیٹ ہوا

کوئی تو ڈھونڈتا ہے ذائقے مگر ہم کو
اگر چنا بھی ملے میٹ کی پلیٹ ہوا

کسی کی یاد میں سوکھے ہوؤں کو جب تولا
تو پانچ من سے نہ کم ایک کا بھی ویٹ ہوا

کوئی ہے منتظر اس کا تو کوئی اس کا ہے
مگر رضا کا کسی در پہ بھی نہ ویٹ ہوا

اب ایک دلچسپ پر لطف واقعہ سنئے۔ یہ مجھے خود رضا صاحب نے بتایا تھا۔ میرے مشرقی افریقہ میں آنے میں ابھی دیر تھی۔

جب ماؤ ماؤ کی خونیں تحریک آزادی کینیا میں شروع ہوئی تو غالباً 1951ء کے آخر میں ایشائیوں نے انگریزی سرکار پر زور ڈالا کہ ان کی نسل کے نوجوانوں کو بھی فوج میں بھرتی کیا جائے۔ اس سے پہلے ایشیائیوں کو فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔ حکومت نے محدود طور پر یہ بات مان لی۔ چنانچہ ایشین مین پاور (MANPOWER ASIAN) کا محکمہ قائم کیا گیا جس کا کام ہر ایشائی باشندے کو جو تیس سال سے کم عمر کا ہو لازمی فوجی ٹریننگ دلوانا تھا اور پھر فرنٹ پر بھیجنا تھا۔ تاہم محکمے کے ڈائریکٹر کو اختیار تھا کہ وہ جس نوجوان کو چاہے اس بھرتی سے مستثنیٰ قرار دے سکتا تھا۔ چنانچہ سب کو سمن جاری کر دیئے گئے۔ رضا صاحب کو بھی مل گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ انہوں نے ڈائریکٹر سے ملاقات کی ٹھان لی۔ اتفاق سے ممباسہ کی مشہور شخصیت ڈاکٹر حسن اس کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے جو اچھے اردو داں بھی تھے اور جنہیں شعروشاعری کا بھی شوق تھا۔ رضا صاحب جب ڈاکٹر صاحب کے دفتر پہنچے تو وہاں سینکڑوں کی تعداد میں نوجوان ڈاکٹر حسن سے ملنے کے منتظر تھے۔ اب آگے خود رضا صاحب کی زبانی سنیئے جو انہوں نے میرے دریافت کرنے پر ایک خط میں لکھا تھا:

"سینکڑوں نوجوانوں کے اس جمگھٹ میں میری باری کب آتی۔ آخر مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ میں نے کاغذ پر ذیل کا قطعہ لکھا اور ان کے افریقی چپراسی کے ہاتھ میں دے کر سواحلی زبان میں کہا میں ڈائریکٹر صاحب کا ڈگو (DUGU) (سواحلی زبان میں بھائی کو کہتے ہیں) ہوں۔ یہ خط ان کے ہاتھ میں دے آؤ۔ نہایت ضرور ہے۔ میں نے لکھا۔

خزاں کے موسم میں تو ہے ممکن
گلوں کا ہنسنا کلی کا کھلنا!
مگر سنا ہے رضا نے سب سے
نہیں ہے ممکن حسن سے ملنا

جو بار آور یہ میرا خط ہو
تو کہنا لوگوں کا سب غلط ہو

مجھے یقین تھا ڈاکٹر صاحب یہ خط پاکر مجھے جلد یا بدیر ضرور بلوائیں گے۔ اس لیے اس اثنا میں میں نے جواب کے طور پر ایک قیاسی رباعی کا ڈول بھی اپنے ذہن میں ڈال لیا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر کام میں لاسکوں۔ لیکن خلاف توقع چند ہی منٹوں میں افریقن چپراسی واپس آگیا اور کہا کہ مجھے اندر بلایا ہے۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے زور سے قہقہہ مارا اور اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ "آیئے شاعر صاحب۔ کہئے آپ کی کیا خدمت کی جائے؟" میں نے تڑاق سے رباعی سنادی۔

آقائی کا دعوی نہیں اس خادم کو
دولت کی ضرورت نہیں اس خادم کو
شاعر کو سپہ گری سے فارغ کیجئے
کچھ اور تو حاجت نہیں اس خادم کو

ڈاکٹر صاحب نے پھر زور سے قہقہہ لگایا اور میرے نام کے سمن پر مستثنیٰ (EXEMPTED) لکھ دیا۔۔۔۔"

ستمبر 1952ء کا واقعہ ہے۔ نگارا (نیروبی کا ایک علاقہ ہے) کے نکڑ پر سید توصیف حسین امروہوی واصف کا مطب ہوا کرتا تھا۔ اکثر شام کو دو چار شاعر بھی وہاں جمع ہوجایا کرتے تھے۔ ایک روز شام کو مطب میں حکیم واصف کے یہاں پنڈت لکشمی نرائن گردش، اسحٰق مرزا قاری اور رضا صاحب بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے کہ مشہور شاعر سریندر ناتھ زاہد نشے میں جھومتے تشریف لائے۔ زاہد صاحب خوش گو اور نہایت خوش گلو شاعر تھے۔ اپنے نپے تلے کلام اور کھنکتی آواز سے محفل پر چھا جاتے تھے۔ مگر شراب بہت پیتے تھے اور کینہ بھی بہت رکھتے تھے۔ رضا صاحب کی صاف گوئی اور اصول پرستی کے بڑے شاکی تھے۔ اس روز کچھ زیادہ ہی پیئے ہوئے تھے۔ جیسے ہی مطب میں داخل ہوئے اور رضا صاحب کو دیکھا تو لرزتے ہاتھوں سے جیب سے ایک پرچہ نکالا اور بھری محفل میں رضا صاحب سے

مخاطب ہو کر پہلے ایک مصرع اور پھر ایک قطعہ پڑھا۔

ہم کہے دیتے ہیں رضا صاحب
جو مکرنا نہ جانتے ہوں انہیں
آج کل لوگ "فول" کہتے ہیں
بے اصولی پہ جو رہیں قائم
ان کو اب "بااصول" کہتے ہیں

رضا صاحب نے بھی اسی انداز میں فوراً کہا۔

زاہدا! تو نے کیوں مجھے چھیڑا

اور پھر کچھ سوچ کر اسی بحروزن میں قطعوں کی بوچھاڑ کردی:

تجھ کو برسوں سے جانتا ہوں میں
کام ہے تیرا دون کی لینا
گالیاں دینا اہل دولت کو
شعر کہنا شراب پی لینا

آٹھ دس قطعے فی البدیہہ کہہ سنائے۔ صرف چار ہی یاد ہیں وہی درج کیئے جاتے ہیں۔

تیرے جیسے سخن وروں کے لیے
کچھ بھی مشکل نہیں ہے جی لینا
رہنا معروف نعرہ بازی میں
ملے فرصت شراب پی لینا

○

مئے بھی مانگے گا زر بھی مانگے گا
شاعری کاروبار ہے تیرا
شعر میں کوستا ہے اچھوں کو

نکتہ چینی شعار ہے تیرا

○

کام کرنے سے کب غرض تجھ کو
میکدے سے وقار ہے تیرا
بیوی بچوں کی فکر کیا تجھ کو
شاعروں میں شمار ہے تیرا

○

مفت کی مل رہی ہے پینے کو
شاعری کاروبار اچھا ہے
اسے دی گالیاں اسے کوسا
نکتہ چینی شعار اچھا ہے

مسٹر ڈی۔کے۔شاردا ٹائمز آف انڈیا بمبئی کے اسسٹنٹ ایڈیٹر (بعد میں سرچ گائٹ پٹنہ کے ایڈیٹر ہوگئے تھے۔ وہیں حرکت قلب کے بند ہونے سے انتقال کیا) مقرر ہونے سے پہلے ٹریبیون' نیروبی کے ایڈیٹر تھے۔ شعر میں رضا صاحب سے مشورہ کرتے تھے۔ بڑے مخلص دوست تھے۔ ایک بار رضا صاحب نے ایک انگریزی مضمون انہیں نظر ثانی کے لیے بھیجا۔ مگر کئی دن تک جواب نہ آیا۔ فون پر بات نہ ہو سکی کیونکہ وہ خراب تھا۔ ایک دن جھلا کر رضا صاحب نے باتوں باتوں میں یہ خط لکھوا کے بھیج دیا۔

چند دن گزرے جناب شاردا
آپ کو بھیجا تھا میں نے ایک خط
تاکہ وہ ہر بات ہوجائے درست
آپ کی نظریں جسے سمجھیں غلط

○

لیکن اب تک کچھ نہیں اس کا سراغ
جانے کیوں دل آپ کا ملتا نہیں
میں پتا جو لوں تو آخر کس طرح
فون تک تو آپ کا ملتا نہیں

○

بس یہی سوچا کہ لکھ دوں چند شعر
اور تو کچھ مجھ سے ہوسکتا نہیں
اور میرا کچھ بھی کھوجائے رضا
شاعری کا فن میں کھو سکتا نہیں

○

ان کا جواب فوراً آیا اور نظر ثانی کیا ہوا انگریزی مسودہ بھی لف تھا۔ رضا صاحب نے اسی وقت جواباً لکھ بھیجا۔

میں نے سمجھا تھا کہ لبی تان لی
آپ نے پر میرے دل کی جان لی
اور تو کچھ کر نہیں پایا، مگر
شکریہ کہنے کی میں نے ٹھان لی
آپ کا کرتا ہوں بے حد شکریہ
شکریہ اے شاردا صد شکریہ

جناب عبدالرحمٰن بزمی (آج کل انگلینڈ میں ہیں) نے ذیل کا خط رضا صاحب کو لکھا۔

برادرم رضا صاحب!
ہدایہ تسلیمات! مزاج گرامی!
میری شادی کی تاریخ تو یکم جنوری 1956ء مقرر ہوئی تھی، لیکن اب یکایک ایک ناگزیر صورت حال کے تحت 15 دسمبر 1955ء کا دن مقرر کردیا

گیا ہے۔ آپ کی طرف سے کمی وقت کا شکوہ بجا نہ ہوگا۔ لیکن "بمعہ شکوہ" تشریف لائیے۔ دیگر اعزہ واقربا اور احباب کو دعوت شرکت "بمعہ عیال" دی جا رہی ہے۔ آپ کو "بمعہ شکوہ"

امید ہے کہ میرے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی یہ دعوت شرف قبولیت حاصل کرکے رہے گی۔

نیاز آگیں
عبدالرحمٰن بزمی

رضا صاحب اس تاریخ کو ولیمے میں شامل نہیں ہوسکتے تھے چنانچہ انہوں نے اسی وقت ذیل کا قطعہ لکھ کر روانہ کردیا۔ قطعے پر 13 دسمبر 1955ء کی تاریخ ہے۔

آج ہی مجھ کو ملا آپ کا دعوت نامہ
اس سے پہلے نہ سنی آپ سے میں نے یہ خبر
آپ. کے سامنے فریاد کروں یا نہ کروں
فیصلہ آپ ہی کرلیں گے مگر اہل نظر
مجھ سے تو آیا نہ جائے گا ولیمے میں اب
"شکوہ" چھو آئے گا (ممکن ہے بہت) آپ کا در
آپ کو' دوست! مبارک ہو نیا دور حیات
اور مبارک ہو نئی راہ نیا رخت سفر

مسٹر ناہر سنگھ مانگٹ نیروبی کے مشہور وکیل فوجداری تھے۔ ستمبر 1956ء میں انہوں نے اسمبلی الیکشن لڑا' اور کامیاب ہوئے۔ وہ رضا صاحب کے بزرگ دوستوں میں سے تھے۔ حیدری صاحب اور رضا صاحب انہیں مبارک باد دینے کے لیے ان کے گھر گئے۔ مانگٹ صاحب شعروشاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ چھوٹتے ہی فرمایا "خالی ہاتھ آگئے؟ کوئی قطعہ نہیں' رباعی نہیں' نظم نہیں" رضا صاحب نے وہیں بیٹھ کر تین شعر کا ایک قطعہ اور رباعی کہہ کر پیش کی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

قطعہ

کچھ بھی ناممکن نہیں اہل لیاقت کے لیے
اہل ہمت کے لیے اہل کرامت کے لیے
ہم کو آخر کار یہ تسلیم کرنا ہی پڑا
جیت لینا انتخاب آساں ہے مانگٹ کے لیے
اے رضا اس جیت پر لکھ کر مبارک باد دے
آفریں کہہ' شاد ہو' سو بار چل کر داد دے

رباعی

پھولوں کی نفاست کے نظارے دیکھے
سبزے پر اوس کے ستارے دیکھے
ناہر کو بیاباں گرتے دیکھے
نیروبی میں مانگٹ کے شرارے دیکھے

نیروبی سے مگاڈی کی طرف جاتے ہوئے کوئی پندرہ بیس کوس پر نگونگ کے پہاڑیوں (NGONG HILLS) کے دامن میں بارش کے بعد دھوپ میں کھمبی بہت پیدا ہوتی ہے۔ کھمبی کو ہندی میں کُکرمتا' انگریزی میں MUSHROOMS اور پنجابی میں کھمب کہتے ہیں۔ پنجابی بول چال میں یہ مونث ہے۔ 3 دسمبر 1960ء کو رضا صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی کار میں کھمبوں کی تلاش میں گئے۔ اتفاق سے اس روز دھوپ کے باوجود کچھ خنکی ہی سی رہی اس لیے کھمبیں ابھر نہ سکیں۔ جو ابھریں بھی وہ بھی کسی وجہ سے سڑ چکی تھیں صرف ان کا تنا ہی کھڑا پایا گیا۔ کار میں سب کوسوں بھٹکے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ گھر واپس آئے تو رضا صاحب نے دوستوں کے کہنے پر یہ چند شعر رقم فرمائے۔

کہاں وہ شعلہ اظہار آج کھمبوں میں
ملا نہ پہلا سا وہ پیار آج کھمبوں میں
پچاس کوس گئے اور چار ہاتھ آئیں

یہ کس نے بھر دیا انکار آج کمبوں میں
یہ کیسی تن کے کھڑی ہیں بغیر چتر شمی
ہیں کیسے جنگ کے آثار آج کمبوں میں
گنوایا "کار" کا ایندھن تھکے بھی ناحق ہم
گئی یہ شام ہی بے کار آج کمبوں میں
ہزاروں ہوں گی مگر مست خواب زیر زمیں
ملی نہ ایک بھی بیدار آج کمبوں میں
رضا اداس ہے اس واسطے کہ کچھ نہ ملا
پھری اگرچہ بہت "کار" آج کمبوں میں

یہ دو شعر رضا صاحب نے میرے نام اپنے خط مورخہ 29 ستمبر 1966ء کے آخر میں "چلتے چلتے" لکھ دیئے تھے۔ خط قاہرہ (مصر) سے لکھا گیا تھا۔

قابل ذکر مری مصر میں تنہائی ہے
میں تماشا ہوں یہاں، خلق تماشائی ہے
مجھ پہ اہرام کا کیا کیا ہے تسلط دیکھو
وہ تو ہنستے ہیں میری جان پہ بن آئی ہے

رضا صاحب اس ورلڈ ٹور (WORLD TOUR) پر تھا تھے۔ ظاہر کہ تنہائی انہیں کھلنے لگی ہوگی۔

دسمبر 1966ء کا ذکر ہے۔ رضا صاحب آخر آخر میں دوپہر کے بعد آفس نہیں جایا کرتے تھے۔ ایک روز بعد دوپہر عاشق صاحب اور میں ان کے اسٹڈی روم میں بیٹھے تھے کہ غالب کی مشہور رباعی کا ذکر چھڑ گیا جس کا چوتھا مصرع ہے۔

"گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل"۔ عاشق صاحب نے کہا کہ کیا آپ نے بھی کچھ ایسی رباعیاں کہیں ہیں جن کا چوتھا مصرع محاورے یا ضرب المثل پر مبنی ہو۔ رضا صاحب نے جواب دیا کہ دانستہ تو نہیں کہی مگر ابھی کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فوراً

ذیل کی رباعیاں لکھوادیں۔

دنیا میں بشر کو نہ سنبھلنا آیا
اپنے نہ کبھی پاؤں سے چلنا آیا
ہاں اس کو زرومال کا خادم بن کر
گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا آیا

○

میں بات یہ کہتا ہوں ادب کی اے غم
ہے شور سے نفرت مجھے کب کی اے غم
میں صبر سے کاٹوں گا تیرا دور جفا
دیتا ہے یہ کیا گیدڑ بھبکی اے غم

○

چڑیوں کی طرح چگے گا کب تک چوگا
رہ جائے گا اس طرح تو اپنے جوگا
اٹھ پاؤں بڑھا دل ہے اگر منزل میں
لڈو کہنے سے منہ نہ میٹھا ہوگا

مسٹر کے۔کے۔ کول انڈین کمیشن کے آفس میں شاید پریس اٹیچی (اٹاشی) تھے۔ اردو لکھنوی لہجے میں بولتے تھے۔ شعر کہتے تھے اور شعروشاعری پر جان دیتے تھے۔ رضا صاحب کے خاص دوستوں میں تھے۔ ان کے دم سے بھی نیروبی کی محفلوں میں بڑی گہما گہمی تھی۔ 3 ستمبر 1968ء کو غالباً یہ ان کی ہندوستان کو واپس روانگی کا دن تھا' وہ رضا صاحب سے ملنے آئے۔ میں بھی موجود تھا اور لوگ بھی تھے۔ سب ازراہ مذاق اصرار کرنے لگے کہ آپ چندے اور رک جائیں مگر وہ کیوں کر مان سکتے تھے۔ رضا صاحب نے فی البدیہہ یہ قطعہ پڑھا۔

کول صاحب! ہماری خواہش ہے

چند روز اور آپ رک جاتے
ہم اگر آپ کی جگہ ہوتے
اس محبت کے آگے جھک جاتے

رضا صاحب بیس سال سے بھی زیادہ عرصے تک دشت مشرقی افریقہ میں شعر وادب کے پھول کھلاتے رہے۔ ان کے وطن مراجعت کرجانے کے بعد ہمارے یہاں گویا سناٹا ہوگیا۔ جب ہم اہل مشرقی افریقہ ہندوپاک میں ان کی علمی' ادبی فتوحات کے قصے سنتے ہیں تو ہمارے دل باغ باغ ہو اٹھتے ہیں مگر ہم یہ کیونکر بھولیں کہ رضا صاحب نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ (جو یقیناً" ہمارے علاقوں میں اردو کے عروج کا زمانہ بھی ہے) یہیں ہمارے درمیان مشرقی افریقہ میں گزارا تھا۔

رضا صاحب کے خودنوشت دیباچے

جناب کالی داس گپتا رضا عظیم ادباء کی صف میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین خصوصاً" دیباچوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ فلسفہ نہیں بگھارتے۔ سیدھی سادھی بات، مہذب ڈھنگ سے اس طرح پیش کرتے ہیں' جو اعلیٰ تعلیم یافتہ مخلص ادباء کا انداز گفتگو ہوا کرتا ہے۔

رضا کے دیباچوں کی انفرادیت خود اس بات کی دلیل ہے کہ رضا میں منفرد تحقیق وطلب کے جراثیم بدرجہ اتم موجود ہیں' ورنہ ایک عظیم ساہوکار کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ علم جیسی عظیم دولت کا بھی ساہوکارا سنبھالے چند کتابوں سے بعض دیباچے جو مختصر ہیں' مکمل صورت میں اور بعض کی صرف تلخیص پیش کی جائے گی۔ ملاحظہ فرمائیں بعض کتابوں مثلاً" کلیات چکبست یا دیوان غالب کے دیباچے اتنے طویل اور مفصل ہیں کہ ان کی تلخیص بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔

شعلہ خاموش۔۔۔3 جنوری 1968ء

"..... مشق نہ ہونے کی وجہ سے مجھے اردو نثر لکھتے ہوئے سخت الجھن ہوتی ہے۔ خصوصاً" جب کہ میری اپنی ذات زیر بحث لائی جارہی ہو۔ مگر میں یہ سطور فقط اس بات کا اقرار کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں' کہ میں کوئی استاد ہوں نہ کوئی نقاد' محض ایک شاعر ہوں۔ بوقت فرصت شغل کے طور پر شعر کہتا ہوں۔ میں نے زبان وفن شعر کا اکتساب اساتذہ سے کیا ہے' اور مزید سیکھنے کا شوق ہے۔ ارباب نقد ونظر سے صرف اتنا ہی التماس ہے کہ وہ جہاں کہیں لغزش یا سقم پائیں۔ براہ مہربانی مجھے

معذور سمجھتے ہوئے آگاہ فرمائیں۔ تاکہ اگر کوئی اور ایڈیشن نکلے تو اس میں اصلاح کردی جائے۔

اس مجموعہ کلام میں 1942ء سے 1967ء تک کا کلام شامل ہے۔ اس کلام کو محض اس بنا پر منتخب کیا جاسکتا ہے' کہ منظومات کا ایک بڑا حصہ جو ہنگامی شاعری پر مشتمل تھا' اس میں شامل نہیں کیا گیا۔ سال فکر درج کردیا گیا ہے۔ تاکہ پڑھنے والے کو شاعر کے ذہنی ارتقاء کا اندازہ ہوتا رہے' سال فکر کو دیکھتے ہوئے سب سے پرانی نظم یا غزل جو اس مجموعہ میں درج ہے' غالباً" چودہ سال کی عمر میں کہی گئی تھی۔ اس نظم کے کوئی چھ سال بعد میں ہندوستان کو چھوڑ کر کینیا (مشرقی افریقہ) میں آگیا۔ اور آج تک یہیں سکونت پذیر ہوں۔

چونکہ میری زندگی کا بیشتر' اور بہترین حصہ ہندوستان سے باہر گزرا' جس میں باوجود شاعری سے عشق ہونے کے مجھے اپنی منظومات کو منظر عام پر لانے کے خاطر خواہ مواقع میسر نہیں آئے۔ اور جو کچھ بھی میں نے کہا میری فائلوں ہی میں بند ہوتا رہا۔ اس لحاظ سے میں نے اپنے مجموعہ کلام کا نام "شعلہ خاموش" تجویز کیا ہے' جو میرے ہی ذیل کے شعر سے لیا گیا ہے۔

یہ غلط ہے حسن ہے آتش فشاں عشق خود ہی شعلہ خاموش ہے"

مندرجہ بالا "التماس" میں نہ صرف حسن اختصار کی بہار نمایاں ہے بلکہ انکسار' لجاجت اور کسر نفسی کے شائبات بہت ابھرے ہوئے ہیں۔ نیز اس کے ذریعے جو قیمتی احساس ہمارے لیے مطالعہ رضا میں کام آنے کے لائق ہے' وہ یہ ہے کہ رضا کی یہ اردو نثر نگاری کینیا میں قیام کے دوران کی ہے۔ وہ اس وقت بھی کتنی دھلی منجھی زبان استعمال کرتے تھے۔

رضا کا یہ اولین دیباچہ ہے' اب ان سطور کے بعد آپ اس "شورش پنہاں" کو دیکھیے جس کے بغیر شعلہ' شورش نہیں بنتا۔

شورش پنہاں!۔۔۔ 21 اگست 1969ء

"..... شاعر کا کام خود محسوس کرنا اور پھر انہیں محسوسات کا احساس قاری

کو دلانا ہوتا ہے۔ رابرٹ ایڈمز (Robert Adams) نے کہا ہے کہ شاعر کا کام درس و تدریس نہیں ہے۔ اگر وہ درس دیتا بھی ہے تو وہ اس ٹیچر کی طرح نہیں دیتا جو طلباء کو کلاس روم میں پڑھاتا ہے۔ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے محسوسات کو قاری کے سامنے پیش کرتا ہے جن سے قاری ایسا اثر لیتا ہے جو نظر کو وسیع کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور جس سے انسان فہمی کی صلاحیت مزید اجاگر ہوتی ہے۔

شاعر ہمیشہ خاموش' بے ربط اور غیر واضح افکار کو اپنی قوت تخلیق سے ایک مقام پر سمیٹ لاتا ہے۔ اور انہیں زیادہ سے زیادہ حسین' واضح' مربوط اور بولتے ہوئے انداز میں قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جب وہ کبھی ایک عظیم نظم لکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس سے آرٹ کی عظمت سامنے آ جاتی ہے۔ مگر جب وہ ایسا کرنے میں ناکام ہوتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے آرٹ میں زوال آگیا ہے۔

جب تھامس لوپیکاک (Thomas Lovepeacock) نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ تہذیب کی ترقی ایک روز شاعری کو بے ضرورت بنا دے گی اور رفتہ رفتہ ختم کر دے گی تو شیلے (P.B.Shelley) نے اپنی ایک نظم "مدافعت شاعری" (Defence of Poetry) میں اس نظریے کے خلاف سخت آواز اٹھائی تھی' آج اس نظم کو ڈیڑھ سو سال کا عرصہ ہونے کو آیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ شاعری آج بھی اس قدر زندہ و پائندہ ہے جتنی کہ ڈیڑھ سو سال پہلے تھی۔ بلکہ ہزاروں سال پہلے تھی کیونکہ شاعری کا وجود ہوائی جہازوں' ایٹم بموں' اونچے مکانوں' پکی سڑکوں اور خوبصورت پوشاکوں کا مرہون منت نہیں ہے۔ اور نہ ہی بھوکے ننگے انسانوں' بوسیدہ مکانوں اور بازار میں بکتے ہوئے جسموں کا تابع ہے۔ شاعری زمانے کے مطابق' انتہائی درجہ کے اعلیٰ و ارفع افکار و محسوسات کو غایت درجے کے ہوزوں' رواں مترنم اور مناسب الفاظ میں ادا کرنے کا دوسرا نام ہے۔

قاری شاعری کے شاہکار میں عظمت کا متلاشی ہوتا ہے۔ اور شاعر پڑھنے والے سے داد و تحسین کا متمنی۔ اگر شاعر سمجھتا ہے کہ اس کے شاہکار کا متوقع

استقبال ہوا ہے تو اسے یک گونہ اطمینان ضرور حاصل ہوتا ہے۔ مگر یہ اطمینان اس بجا فخر کا مد مقابل نہیں ہو سکتا جو شاعر کو اپنے دل کی گہرائی میں اپنے شاہکار پر ہوتا ہے۔ دراصل اپنے شاہکار کے لیے شاعر کے اندر جو فخر کا قدرتی جذبہ ہوتا ہے اس کی لذت میں کوئی دوسرا شریک ہو ہی نہیں سکتا۔

"لمبی اور خاموش راتوں میں جن میں میرے افکار کے سوا اور کوئی میرا ساتھی نہیں ہوتا' فکر سخن میرے لیے صرف رفاقت کا سامان ہی بہم نہیں پہنچاتی ہے بلکہ ایک ایسی ادبی جدوجہد کی طرف اشارہ کرتی ہے' جو میں پچھلے بیس سال سے ہندوپاک سے دور کینیا (مشرقی افریقہ) کے ایک نہایت کاروباری اور غیر ادبی ماحول میں کرتا آرہا ہوں"۔

رضا نے عرض حال کی سطور میں اپنے شعری نظریے کی حلاوت نہیں فرمائی ہے۔ بلکہ اس کی وضاحت کی ہے جس کی اساس پر وہ شعر کہتے ہیں۔ نیز غیر اردو آشنا ادباء سے مرعوب نہیں بلکہ ان کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔

واضح رہے کہ مشرقی افریقہ سے رضا کی یہ دوسری پیش کش ہے' قاری کو لازم ہے کہ گذشتہ مجموعہ کلام "شعلہ خاموش" میں "التماس" کو نظرانداز رکھ کر اس "عرض حال" کا مطالعہ کریں۔ تب وہ رضا کے قلم کے سفر کو سمجھ سکیں گے اور انہیں رضا کی نثر نگاری بتدریج ترقی یافتہ محسوس ہوتی نظر آئے گی۔

شاخ گل! _____ 18 دسمبر 1972ء .

"میں مشاعرے کا شاعر نہیں ہوں۔ میرا انداز فکر اور کاروباری مصروفیت مجھے اس قسم کے مشاغل میں حصہ لینے میں روکتے ہیں۔ میں خانوں میں بٹا ہوا شاعر بھی نہیں ہوں اس لیے گٹ بندی سے جو فائدے انفرادی طور پر کسی شاعر یا ادیب کو پہنچتے ہیں' مجھے نہیں پہنچتے۔ میری دانست میں میرے کسی گٹ میں شامل نہ ہونے کے دو واضح سبب ہیں۔ ایک یہ کہ میری افتاد طبع گٹ بندی کے بندھنوں کو برداشت کرنے کی اہل نہیں۔ دوسرے یہ کہ میں بزنس میں ہوں۔ اور بے کار کی ہا ہو سے گریز کرنا میری فطرت ثانیہ ہے۔

جو لوگ مجھ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ میرے کچھ اصول ہیں اور میں ان پر سختی سے کاربند رہتا ہوں۔ مگر ہندوستان میں آکر میں نے دیکھا کہ یہاں اصولوں کو نباہنا آسان نہیں' یہاں یہ ہر قدم پر ٹوٹتے نظر آتے ہیں' جس سے مجھے بڑا قلق ہوتا ہے' میرے بعض اشعار سے شاید آپ کو شکست خوردگی کا احساس ہو' اس کی وجہ نقل ملک کے بعد از سرنو ایک بڑے شہر میں اپنا تجارتی مقام بنانے کی جدوجہد اور اصول پرستی کی ناکامی سے پیدا شدہ بے اطمینانی کے سوا کچھ نہیں۔

مندرجہ بالا سے یہ مراد نہیں کہ میں ان باتوں پر ناز کرتا ہوں' ہرگز نہیں' میں آپ ہی میں سے ہوں۔ آپ سے الگ ہو کر میں جی ہی نہیں سکتا۔ یہ جو گوش گزار کیا ہے' محض اظہار حقیقت ہے۔

"شاخ گل" میں کوشش کی گئی ہے' کہ زبان حتی الوسع با محاورہ اور موضوع کے مطابق ہو فارسی آمیز اردو اور ہلکی پھلکی ہندی نما اردو' دونوں اسالیب کو استعمال میں لایا گیا ہے۔ متقارب ومتدارک کے مزاحف اوزان میں بعض جگہ ہندی اور ان کے پیش نظر مسلمہ اصول سے انحراف کو جائز رکھا گیا ہے' ایک دو نظمیں راویتی بحروزن کی ترتیب سے ہٹ کر بھی ہیں' مگر ان میں رکن برقرار رکھے گئے ہیں' میں جدید شاعری کا مخالف نہیں ہوں مگر اردو میں سپاٹ نثری نظموں کا قائل نہیں....."

میں نے گزشتہ سطور میں کوشش کی تھی کہ آپ کی توجہ ان خود نوشت دیباچوں کی تقابلی حیثیت پر مبذول کراتا چلوں۔ زندگی ہر حال میں رواں دواں ہے۔ اسے قرار نہیں۔ یہ راز رضا سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی باعث وہ اپنی ہر تخلیق کو آنے والے کل کا ماضی تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دیباچوں میں ہمیں رضا کے ذہن کا نیا جنم نظر آتا ہے' یہی صالح فکر کی شناخت ہے کہ وہ آگے کی جانب دیکھتی ہے' اور ہر گزرنے والی حقیقت کو صراط سے گزرنا سمجھتی ہے۔

اجالے!..... 25 اگست 1975ء

"اجالے' میرے اسلامی رنگ کے اشعار کا چھوٹا سا مجموعہ ہے۔ جس میں

چند نعتیں، سلام، رباعیات اور قطعات ہیں۔ تین چار نظموں کو چھوڑ کر تمام اشعار 1970ء سے پہلے کے ہیں۔ جب کہ میں کینیا، مشرقی افریقہ کے شہر نیروبی میں مقیم تھا۔ آپ کہیں گے تقریباً" ربع صدی کا قیام افریقہ اور صرف یہی چند اوراق؟ حقیقت یہ ہے اس سے کم از کم تین گنا کلام جو نعتوں اور سلاموں پر مبنی تھا، 1970ء میں نقل ملک کے دوران میں ضائع ہوگیا۔ لہٰذا میرے اس مجموعے کی ناقابل لحاظ ضخامت سے یہ اندازہ کرنا غلط ہوگا کہ صرف منتخب کلام شائع کیا گیا۔ یہاں وہ تمام اشعار نذر احباب کیے جا رہے ہیں۔ جو کسی نہ کسی طرح میرے پاس بچ رہے، انتخاب کی گنجائش ہی نہ تھی، یقین ہے کہ کھوٹا کھرا پرکھتے وقت اس حقیقت حال کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

قاری کی سہولت اور آگاہی کے لیے کہیں کہیں حاشیے بڑھائے گئے ہیں، شاید یہ کسی حد تک دلچسپی کا باعث ہوں۔ مشرقی افریقہ میں پہلے ہی اردو کے شاعر تھے۔ مگر میرے وہاں پہنچنے کے بعد محفلوں اور مشاعروں میں بے حد باقاعدگی آگئی تھی۔ جو بیس سال یعنی 1969ء تک شدومد کے ساتھ قائم رہی۔ انجمنیں بنیں، مشاعرے ہوئے، لوگوں کے ذوق میں اس قدر ترقی ہوئی کہ اگر کچھ عرصے تک کوئی بزم شعر منعقد نہ ہوتی تو اس کے انعقاد کے لیے شائقین کی طرف سے اصرار شروع ہوجاتا۔ اقبال ڈے، حسین ڈے، بزم میلاد النبیؐ، جشن دیوالی، ہندوؤں، سکھوں، مسلمانوں کی شادیوں پر سہرے، آریہ سماج، سناتن دھرم کے سالانہ جلسوں میں مشاعرے، ریڈیو پر مشاعرے، گھروں میں تقاریب غرض کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جاتا تھا۔ جس پر پوری تابناکی کے ساتھ محفل برپا نہ کی جاتی ہو، میرے غریب خانے پر بھی ہر ماہ محفل منعقد ہوتی تھی، جس شائستگی اور رکھ رکھاؤ کو دیکھ کر ماہر القادری بھری محفل میں کہنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ لکھنؤ اور دہلی کی محفلیں آنکھوں کے سامنے پھر گئیں۔ میرے وہاں وہ دو دفعہ رونق محفل بنے۔ ایک طرحی مشاعرے میں قافیہ ردیف "جہاں ہیں" "رواں ہیں" تھے۔ اس میں انہوں نے میری غزل (میرے دوسرے مجموعے کلام "شورش پنہاں" میں شامل ہے) سن کر تعریفی اور

توضیحی کلمات کے بعد فی البدیہہ کہا تھا۔

جہاں میں ایسے انساں بھی کہاں ہیں رضا شاعر ہیں اور شیوا بیاں ہیں

"تمنا ہے میرا یہ حقیر سا مجموعہ جس پر میرا دل وجاں نثار ہے۔ قاری کے لیے باعث تسکین دل وجاں ہو....."

اب دیکھیے کہ رضا نے اسلامی رنگ کے کلام کو معرض اشاعت میں لاکر کس اعلیٰ وارفع ڈھنگ پر اپنے مزاج کی اٹھان کو پرورش کیا ہے' وہ مسلمانوں سے بد دل نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے بہی خواہ ہیں' وہ قطعی طور پر سیکولر ذہن کے انسان ہیں۔

رضا کے قلمی سفر کی پانچویں منزل (اردو میں) جناب جوش ملسیانی مرحوم ومغفور کے مکتوبات کی وہ ترتیب ہے۔ جو انہوں نے کتابی شکل میں مکتوبات جوش ملسیانی بنام رضا شائع کی ہے۔ اس دیباچہ کی حیثیت کئی قسم کی ہے۔ آیئے اسے پڑھیں پھر غور کریں۔

"مکتوبات جوش ملسیانی بنام رضا!" 1976ء

"واقعہ بہت پرانا ہے۔ تقریباً" چالیس سال گزر چکے ہوں گے۔ مجھے یاد ہے شام کے چھ بجے کے قریب چھکڑے پر پنڈت جمنا داس کی لاش مکندر پور لائی گئی تھی (پنجاب کے ضلع جالندھر میں میرا آبائی گاؤں) ایک کہرام مچ گیا تھا۔ منڈھائی کے میلے (مکندر پور سے سات کوس دور ایک گاؤں ہے۔ جہاں ایک فقیر کے مزار پر ہرسال ایک زبردست اجتماع ہوتا تھا۔ شاید اب بھی ہوتا ہو) میں معمولی سی بات پر ایک دیہاتی نے ابلتے تیل کی کڑھائی ان پر الٹ دی' جمنا داس بری طرح جھلس گئے۔ اور جانبر نہ ہوسکے۔ پنڈت پشاوری رام واسدیو کے یہاں بہت سے رشتہ دار تعزیت کے لیے آئے۔ میں شاید دس سال کا ہوں گا۔ ایک شام دیکھا کہ پشاوری رام کے چھوٹے سے برآمدے میں کوئی بزرگ لیٹے ہوئے لالٹین کی روشنی میں بڑی رات گئے تک کچھ پڑھتے لکھتے رہے۔ انہیں بزرگ کو دوسرے روز چلتے پھرتے بھی دیکھا۔ مختصر مگر چاق وچوبند' قد بمشکل پانچ سوا پانچ فٹ' بھری بھری کتروان داڑھی' خال خال سفید بال' رنگ گندمی' سر پر سفید پگڑی۔ دھوتی باندھے' بند گلے کا کوٹ

پنے' معمولی پڑھے لکھے' دیہاتی معلوم ہوتے تھے' برسوں بعد کھلا کہ یہی ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی ہیں۔ اور پنڈت جمنا داس مرحوم آپ کے برادر نسبتی تھے۔ گویا مکندر پور میں استاذی قبلہ کے سسرال تھے اور برادر معظم عرش ملسیانی کے ننھیال۔

میرے گاؤں کے ایک صحافی پنڈت مست رام تقسیم ملک کے بعد لاہور سے آکر جالندھر کے ایک روزانہ اخبار (شاید پربھات) میں کام کرنے لگے۔ اور وہیں سے 1948ء میں انہوں نے ایک رسالہ "داستان" کے نام سے جاری کیا' جس کے حصہ نظم کی دیکھ بھال میرے ذمے تھی۔ انہوں نے ایک روز مجھ سے کہا کہ جیسے بھی ہو پہلے شمارے میں قبلہ جوش ملسیانی صاحب کا کلام شائع ہونا چاہیے' چنانچہ اس بہانے میں ایک روز جالندھر سے پندرہ میل دور استاذی قبلہ کی جائے سکونت نکودر پہنچا۔ استاذی قبلہ بیٹھک میں چارپائی پر دراز حقہ پی رہے تھے۔ آپ کو دیکھتے ہی میں آداب بجا لایا۔ آپ نے جس شفقت پدرانہ سے میرا استقبال کیا۔ اسے میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ برادرم عرش کی والدہ محترمہ نے تو گویا مجھے اپنا بھتیجا ہی سمجھا اور میری آمد پر خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔ ایسی صورت میں ایک غزل تو کیا اگر استاذی قبلہ کی بیاضیں بھی مانگ لے جاتا تو آپ انکار نہ کرتے' قصہ کوتاہ کھانا کھایا۔ اور چند غزلیں رسالے کے لیے نقل کرلیں۔ پھر کچھ نیا کلام اصلاح کے لیئے پیش کیا۔ آپ نے کرم فرمایا۔ کہ وہیں اصلاح فرمادی۔

27 جنوری 1976ء کو رات 9 بج کر 50 منٹ پر بمبئی ٹیلی وژن پر خبر سنی کہ استاذی قبلہ اب اس دنیا میں نہیں رہے آپ کی غزل کا ایک شعر ذہن میں آیا۔

شوق کا معیار کس سے پوچھیے طور کا شعلہ بھی اب خاموش ہے

مصرع ثانی کے عدد گنے تو 1623 نکلے "سیل رنج" (353) کے تعمیے کے ساتھ قطعہ تاریخ کہا۔

دے گیا داغ آخری شاگرد داغ اب سخن دانی کفن بردوش ہے
بوئے گل بے پر ہے مرگ جوش پر زلف عنبر یار' بار دوش ہے

بے حواسی کے ہیں عالم میں ادیب ہوش میں' اب کون اہل ہوش ہے
مصرع استاد ہو تاریخ غم تو بھی شاگرد جناب جوش ہے

لکھ دے "سیل رنج" کے ساتھ اے رضا
"طور کا شعلہ بھی اب خاموش ہے"

دو تاریخی قطعے اور بھی کہے تھے' ان میں تعمیہ تخرجہ نہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے وہ بھی درج کیے جاتے ہیں۔

دے گئے داغ الم داغ کے شاگرد رشید
جوش کے بعد ہے اب جوش سخن محض جنوں
سکہ رہتی تھی انہیں نت نئے مضموں کی تلاش
سال رحلت کا ہوا "جوش تلاش مضموں"

جوش بھی اٹھے دنیا سے ہر دل پر غم واویلا
کون ہے جو اس وقت نہیں اشک مجسم واویلا
شعر کی حالت صد افسوس یاس کا عالم واویلا
ان کا ایسا کون ہے اب کس میں وہ دم خم واویلا
"کہہ دے رضا تاریخ وفات فاضل اعظم واویلا"

1976ء

قلم کاری کی تدریجی ارتقاء کی منزل اسی طرح کی ہوتی ہے۔ رضا کے اس دیباچے سے (جس کی یہاں تلخیص ہی دی گئی ہے) یہ اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ ان کے قلم میں زبردست نکھار آتا جا رہا ہے۔ دیباچہ کے ابتدائی حصوں کو لیجئے۔ قلمی بیانیہ حرفت (DESCRIPTIVE PEN - CRAFTMANSHIP) نے کل پرزے دکھانا شروع کردیے ہیں۔ اس دیباچے کی حیثیت اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس کے ذریعے ہم پر خود رضا نیز جناب جوش ملسیانی مرحوم کے مختلف النوع گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس روشنی میں کتنے تاریک گوشے روشن ہوجاتے ہیں۔ ان کی سوانح حیات کی ترتیب کے سلسلے میں یہ حالات بے حد ضروری ہیں۔ آگے چلئے اور

محسوس کیجئے کہ رضا کو تاریخ کہنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ تاریخ گوئی کھیل نہیں ہے۔

ہندوستانی مشرقی افریقہ میں (جلد اول):۔ یکم جنوری 1977ء

افریقہ' مشرقی افریقہ اور مشرقی افریقہ کے ہندوستانیوں پر چند مختصر مگر مستند مقالوں کے علاوہ یہ کتاب چار سوانحی مقالوں پر مشتمل ہے' جو مشرقی افریقہ کی پچھلے ایک سو چالیس سال کی تاریخ کا احاطہ کرتے ہیں۔ ہم 1835ء سے بھی کچھ پہلے جے رام شوجی ایسے بے نظیر تاجر کے ساتھ جزیرہ زنجبار میں داخل ہوئے ہیں۔ اور تقریباً" پچاس سال تک اس کے اور اس کی اسی نام کی فرم کی رہنمائی میں جزائر زنجبار وپیمبا اور مشرقی افریقہ کے ساحلی علاقے (جو اس وقت سلطان زنجبار کی سلطنت کا حصہ تھے) کی سرکار کا لطف اٹھاتے رہتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سید سعید (زنجبار کا تاجر سلطان) جو اسلام کے اباضیہ فرقے (اس فرقے کا بانی عبداللہ بن ایاز تھا۔ اس فرقے کے عقیدے کے مطابق اگر کوئی مسلمان گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ مسلمان نہیں رہتا) سے تعلق رکھتا ہے اور مذہبی معاملات میں انتہا پسند ہے۔ ہندو تاجروں اور آباد کاروں کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہے کہ آج کے زمانے میں بایدوشاید پالگرو (W.C. Palgraw) 1865ء میں کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سلطان سیکولر مزاج کا انسان ہے۔ اسے معلوم ہوا ہے کہ جانوروں کی قربانی ہندوؤں کے پسند خاطر نہیں اس لیے اس نے اسے بند کروادیا ہے' جے رام شوجی اور اس اسٹاف خصوصاً" لدھا داجی جن کی ایمانداری اور راست بازی ضرب المثل ہے۔ بھی سلطان کی مذہبی رواداری کی داستانیں سناتے رہتے ہیں۔

سلطنت زنجبار کی تمام کروڑ گیری کا مختار (Custom Master) صرف جے رام شوجی ہے۔ ایک دن اس کا میجر لدھا داجی ہمیں سلطان کے محل میں لے جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جے رام شوجی وہاں سلطان کا دست راست بنا بیٹھا ہے۔ ہم جے رام شوجی کی شرافت' ایمانداری راست بازی کے لاکھ معتقد سہی تاہم ہمیں مشکل ہی سے یقین آتا ہے۔ کہ جے رام شوجی جو خالص ہندوستانی اور وشنو ہندو

ہے۔ سلطان کے مزاج میں جو صحیح النسل عرب اور راسخ عقیدہ مسلمان ہے۔ اس درجہ دخیل ہو سکتا ہے۔

جے رام شوجی کے انتقال (1886ء) کے چند سال بعد ہمیں علی دینا وسرام کی رہبری میں مسافرت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ وہ 1877ء میں زنجبار پہنچتا ہے۔ اس کا حوصلہ اس کی وسعت نظر ہمیں زنجبار کی چار دیواری سے باہر لے جاتے ہیں۔ ہم اس کے تجارتی قافلوں کے ساتھ ٹانگا نیکا (موجودہ تنزانیہ) کے دشوار گزار جنگلوں سے گزر کر وکٹوریہ کی وسیع وعریض جھیل تک ہی نہیں پہنچتے بلکہ جہازوں کے ذریعہ جھیل کی موجوں کی بہار دیکھتے ہوئے یوگنڈا میں داخل ہوتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہم پہلی بار کینیا سے گزر کر ممباسہ پہنچتے ہیں۔ اسی اثناء میں ممباسہ سے شروع کر کے ہمارے مزدوروں نے افریقہ کے گھنے جنگلوں اور لق ودق صحراؤں میں ہماری سہولت کے لیے ریلوے لائن بچھا دی ہے۔ اب ریل گاڑیاں ممباسہ سے نیروبی اور وکٹوریہ جھیل کے کنارے (کسمو Kisumu) تک چلنے لگی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے بیسیوں ہندوستانی بھائی ریلوے لائن بچھاتے وقت اس پروجیکٹ کے دوران شیروں کے منہ کا نوالہ بنے۔ یہ کہاوت آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی کہ " ایسٹ افریقہ کی ریلوے لائن کے ہر سلیپر کے نیچے کسی نہ کسی ہندوستانی مزدور کا سر دفن ہے۔"

علی دینا وسرام کی وفات (1916ء) سے چند مہینے پہلے اکتوبر (1915ء) میں افریقہ کے ہندوستانیوں کے مایہ ناز لیڈر اور افریقیوں کے بہترین دوست منی لال امبا لال ڈیسائی کی قیادت میں ہم ایک دن اور ایک رات کے ریل کے سفر کے بعد 17 اکتوبر 1915ء کو نیروبی پہنچتے ہیں۔ اس وقت ہمیں معلوم نہیں کہ یہ چھتیس سالہ ہندوستانی نوجوان بلا کا حوصلہ مند لیڈر ہے۔ ہم برابر پونے گیارہ سال سائے کی طرح سیاست کے طوفانی سفر میں اس جیالے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ہمیں (1926ء) میں چھوڑ جاتا ہے۔ اور ہم صرف اس کی یاد کو ڈیسائی میموریل ہال نیروبی کی مشہور عمارت اور لائبریری کی شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ پاتے ہیں۔ 1923ء

کے لگ بھگ جبکہ ہم ابھی منی لال امبا لال ڈیسائی کی ہمراہی میں ہیں' ایک نوجوان ہندوستان سے آکر ہمارے قافلے میں شامل ہوجاتا ہے۔ یہ وہی نوجوان ہے جو آگے چل کر آنریبل مسٹر چانن سنگھ بی۔ایس۔ سی (آنرز' لندن) بیرسٹرایٹ لا' بنا اور جس کے علم کی بارش سے سب ہمیشہ مستفید ہوتے رہتے ہیں' چانن سنگھ کے تجربے نے بہت سی خشک کھیتیاں ہری کردی ہیں۔ پھول کی اچھا کے بغیر اگر کسی کو کسی کے کام آتے دیکھا تو چانن سنگھ کو' اس کا مسلک بلا شبہ یہی ہے۔

رہے بیدار شوق آبیاری گلستاں کو جواں دیکھو نہ دیکھو

اور یہ فن آج بھی جاری ہے (یکم جنوری 1977ء تک جب یہ دیباچہ قلم بند کیا گیا تھا۔ جسٹس چانن سنگھ حیات تھے۔ اب مرحوم کہتے ہوئے دل دکھتا ہے)

ان اوراق میں سادہ بیانی کی قوت اظہار کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ رضا نے نہایت اعتماد کے ساتھ مشرقی افریقہ میں ہندوستان کے باشندوں کا ذکر کیا ہے۔ ویسے تو ہزاروں افراد وہاں آباد ہیں مگر جو وہاں کے معاشرے میں واقعتاً "کچھ حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا ذکر نیز اس کے اسباب اور پھر ان کے ایثار و قربانی کے جذبات کا ذکر کرکے ایک ایک لفظ کو موتی بنا دیا ہے۔ رضا کے نادر پیرایہ بیان نے دل کو اکتاہٹ محسوس ہونے نہیں دی۔ سادگی' شائستگی اور صداقت اس دیباچے کے خاص اجزاء ہیں۔

اردو شعر و ادب میں پنڈت برج نرائن چکبست کی شخصیت بہت نمایاں ہے۔ رضا کو شکایت ہے کہ اگرچہ چکبست پر پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے اردو دنیا میں داد و تحسین حاصل کرچکے ہیں' اس کے باوصف چکبست پر مکمل اور قابل فخر کام جو ان کے شایان شان ہو' ابھی تک نہیں ہوپایا ہے۔

رضا نے یہ بیڑا بہ حسن و خوبی اٹھانے کی سعی کی ہے' جس کی پہلی کڑی کا نام چکبست اور باقیات چکبست ہے۔ اس کا دیباچہ بعنوان پیش لفظ (اول) ملاحظہ کیجئے۔

"چکبست اور باقیات چکبست 26 جنوری 1978ء پیش لفظ (اول)"

پنڈت برج نرائن چکبست صف اول کے شاعر اور ادیب تھے۔ یا نہیں۔ مگر ان کے کلام نظم ونثر کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ اردو ادب میں وہ جس شہرت کے مالک ہیں' وہ اس کے جائز حقدار ہیں۔

1973ء میں جب کہ ان کے انتقال کو سینتالیس (47) برس ہو رہے تھے' میں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ چکبست پر کچھ کام ایسا کیا جائے جو ان کی بلند وبالا شخصیت کے ہر پہلو پر جاری ہو۔

مگر میں ابھی حیات چکبست ہی کے بکھرے تار و پود سمیٹ رہا تھا کہ 1975ء میں ڈاکٹر افضال احمد صاحب کی کتاب "چکبست حیات اور ادبی خدمات" شائع ہوگئی' چنانچہ مجھے اپنے پلان پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ اس مناسبت سے کہ زیر نظر کتاب میں حیات چکبست کے چند ایسے گوشے شامل رہیں' جو یا تو "چکبست حیات اور ادبی خدمات" میں ہیں ہی نہیں' یا کم روشن ہیں۔ اور اس سبب سے کہ چکبست کے باقیات نظم ونثر وافر مقدار میں لیے گئے ہیں۔ میں نے پہلی کتاب "حیات چکبست" کو "چکبست اور باقیات چکبست" کا نام دے دیا ہے۔

چکبست کے کلام نظم ونثر کی ٹوہ ہنوز جاری ہے۔ جیسے ہی معتدبہ مقدار میں مواد اکٹھا ہوجائے گا۔ "باقیات چکبست" حصہ دوم کے نام سے عام مطالعے کے لیے پیش کردیا جائے گا

پیش لفظ دوم 31 اکتوبر 1978ء

"باقیات چکبست" کی ذیل میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس تحریر (نظم ونثر) کو جو چکبست کی مستقل مطبوعات' "وطن کا راگ" "صبح وطن" مضامین چکبست اور ڈرامہ "کملا" کے علاوہ ہے یکجا کردیا جائے' مگر ایسا نہیں کیا گیا اور شاید یہ ممکن بھی نہ تھا۔ اس لیے چکبست پر آئندہ کام کرنے والوں کی سہولت کے لیے یہاں اس مواد کی نشان دہی کی جاتی ہے جو معلوم تو ہے مگر ضخامت کتاب کے پیش نظر یا کسی دوسرے سبب سے جسے شامل کتاب نہیں کیا گیا۔

1- خطوط چکبست۔ چکبست نے سینکڑوں خطوط لکھے ہوں گے۔ مگر ان میں سے

صرف ذیل کے خطوط کا نشان ملتا ہے۔

خط بنام پنڈت نندلال کول طالب: پروفیسر سری پرتاب کالج' سری نگر' یہ خط "بہار کشمیر" کے یادگار چکبست نمبر' فروری 1939ء میں شائع ہوا تھا۔

2- خط بنام دیا نرائن نگم:۔ ایڈیٹر "زمانہ" جس میں چکبست نے نجی مشکل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا "یہ دونوں چیزیں قانونی مشاغل اور شاعری ایک دوسرے کی دشمن ہیں" پھر آپ ہی فرمایئے "آگ اور پانی کو ایک جگہ جمع کیونکر کروں"

3- خط بنام لالہ سری رام:۔ (خمخانہ جاوید جلد دوم صفحہ 329) یہ خط بہت مشہور ہے' اور اس کے حوالے ادیبوں کی تحریروں میں کثرت سے ملتے ہیں۔

4- خط بنام افضل لکھنوی:۔ مورخہ 28 دسمبر 1903ء اس خط سے معلوم ہوا کہ چکبست' افضل خلف اسیر لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے (چکبست' حیات اور ادبی خدمات 23)

5- خط بنام افضل لکھنوی:۔ مورخہ 3 دسمبر 1909ء جس میں ایک غزل "درد دل' پاس وفا جذبہ ایماں ہونا" بھیجی گئی ہے۔(چکبست' حیات اور ادبی خدمات 22) 3 دسمبر سہو کتابت ہے 3 ستمبر ہونا چاہیے۔

6- خط بنام پنڈت برج کشن گریو:۔ مورخہ 17 فروری 1918ء (چکبست' حیات اور ادبی خدمات ص 87) یہ جواب الجواب ہے۔ اس کا صرف حوالہ دیا گیا ہے۔ متن درج نہیں۔

(ب) مباحثہ گلزار نسیم حصہ دوم (مطبوعہ 1913ء)

اس کتاب (دوسرا نام معرکہ چکبست و شرر) کے دیباچے ص 4 میں مولف کتاب مرزا محمد شفیع شیرازی تحریر فرماتے ہیں۔

سنجیدہ مضامین کے علاوہ جو مضامین اودھ پنچ میں جنت کی ڈاک کے سلسلے میں آتش کے خطوط کل (خط 12) کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جناب چکبست کی طرف منسوب کرتے ہیں' اور ہم کو بھی ذاتی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ مضامین مذکورہ جناب چکبست کے لکھے ہوئے ہیں' ان مضامین میں بھی مولوی شرر

صاحب کی زبان دانی کا مضحکہ ضرور اڑایا گیا ہے، مگر کسی مقام پر قومی یا مذہبی تعصب کا شبہ نہیں ہوتا۔ یہ مضامین کتاب کے ص 281 سے شروع ہو کر ص 336 پر ختم ہوتے ہیں۔

(ج) "ڈرامہ کملا"

اس ڈرامے کی غزلیں اور گیت جن میں سے چند کے سوا جیسے میرابائی اور غالب کا کلام، سب چکبست کے طبع زاد ہیں۔

(د) رسائل اور دیباچے۔

مضامین چکبست کے علاوہ ان کے کئی مضمون "صبح امید"، "اودھ پنچ"، "کشمیر درپن"، "زمانہ"، "ادیب"، "اردوئے معلیٰ"، "مرقع" اور "تہذیب" میں بھی شائع ہوئے۔ بعض کتابوں کے دیباچے بھی انہوں نے لکھے۔

میں نے صرف "صبح امید" کے پہلے شمارے اکتوبر 1918ء اور دوسرے شماروں (1920ء جنوری، فروری، مشترکہ مارچ اپریل، مئی، جون، جولائی) میں شائع شدہ چکبست کی تحریریں، مرقع کا ایک مضمون گوکھلے کی تقریریں کا دیباچہ "اردوئے معلیٰ" اور "اودھ پنچ" کے ایک مضمون کو شامل "باقیات" (حصہ نثر) کیا ہے۔ اشعار (حصہ نظم) کے ماخذ کا تفصیلی حوالہ اپنے اپنے مقام پر درج ہوا ہے۔

ان دیباچوں میں رضا نے اردو ادب کی ایک اہم ضرورت کی طرف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جسے ہم چکبست کے سلسلہ مین ان کی پالیسی کا نام دے سکتے ہیں رضا نے اپنی چکبست پالیسی پر نہایت اعلانیہ طور پر یہ کہا ہے کہ چکبست پر کام اس انداز سے نہیں کیا جا سکا ہے، جس کے وہ مستحق ہیں، خود رضا نے اس سمت میں اپنی کارکردگیوں کے نقوش کو نہایت واضح انداز میں پیش کیا ہے۔

انتخاب آتش و غالب 26 جنوری 1980ء

"پنڈت برج نرائن چکبست خود ایک مایہ ناز ادیب اور شاعر تھے۔ اگر میر غالب انیس اقبال کو روایتی درجہ بندی سے بالا مان کر مقابلے میں شامل نہ کیا جائے

تو چکبست کو اردو کے درجہ اول کے شاعروں میں جگہ دی جائے گی' ابھی مارچ 1979ء میں کلکتہ جاتے ہوئے میں دو روز کے لیے الہ آباد ٹھہرا تو ایک نجی صحبت میں احباب میں سے کسی نے کہا کہ چکبست کو زیادہ سے زیادہ سرجہ دوم کے شاعروں میں ممتاز کہہ سکتے ہیں۔ میں چپ ہو رہا۔ تھوڑی دیر میں مجھے فراق صاحب سے میں نے پوچھا کہ آپ ایک طرح سے چکبست کے ہم عصر رہے ہیں' چکبست کی شاعری سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے' چھوٹتے ہی فرمایا <میری نظر میں چکبست صف اول کے سخنور اور سخن شناس تھے"۔

ماہنامہ صبح امید (لکھنؤ) کا پہلا شمارہ اکتوبر 1918 میں نکلا۔ چکبست اس کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے اس میں ایک نوٹ "عطر سخن" کے عنوان سے لکھا۔ جس میں انہوں نے اعلان کیا کہ قدیم مذاق سخن کی یاد تازہ رکھنے کی غرض سے صبح امید میں ہر ماہ قدیم شعراء کے کلام کا انتخاب شائع ہوا کرے گا اور اس کے مکمل ہونے پر یہ انتخاب مجموعہ کی شکل میں شائع کردیا جائے گا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ چکبست غزل میں غالب اور آتش سے اور مسدس میں انیس سے متاثر تھے۔ نفس مضمون اور مطالب و معنی پر نہیں۔ مگر ان کے طرز کلام پر ان تینوں اساتذہ کی چھاپ موجود ہے۔ چنانچہ انتخاب کلام کے لیے چکبست نے سب سے پہلے آتش اور غالب ہی کو منتخب کیا۔ یہ انتخاب کم از کم جنوری 1921ء تک نکلتا رہا۔ ایک دو شماروں میں انتخاب ملتا ہے۔ تاہم بیشتر شماروں میں دونوں کا انتخاب باقاعدگی سے شامل ہے۔

میری نظر سے چار پانچ شماروں کو چھوڑ کر جو دستیاب نہیں ہو سکے اکتوبر 1918ء تا مارچ 1921ء کے تمام شمارے گزرے ہیں۔ میرا قیاس ہے کہ مارچ 1921ء کا شمارہ صبح امید کا آخری شمارہ ہے۔ کیونکہ اس کے بعد کوئی شمارہ باوجود انتہائی کوشش کے نہیں مل سکا۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں اس قیاس میں قطعی غلط ثابت ہو سکتا ہوں۔

انتخاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ چکبست نے ان 20 شماروں میں غالب کا قریب قریب سارا متداول کلام کھنگال ڈالا ہے۔ اگر اس انتخاب کلام

میں سے کچھ میرے ہاتھ نہیں لگ سکا تو یہ میری کوتاہ دستی ہے۔ آتش کا کلیات دو دیوانوں پر مشتمل ہے' پہلا دیوان ضخیم ہے اور دوسرے دیوان کا حجم پہلے دیوان کے اک چوتھائی سے بھی کم ہے۔ چکبست آتش کے پہلے دیوان کا انتخاب تقریباً" مکمل کر چکے تھے۔ مگر دوسرے دیوان تک نہیں پہنچ سکے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ چکبست کی خواہش تھی کہ مکمل ہونے پر یہ انتخاب مجموعہ کی شکل میں شائع ہو مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ اس کے شاید دو سبب ہیں اول یہ کہ چکبست کے ذہن میں ابھی اور انتخاب کرنا باقی تھا۔ دوم چکبست کا بے وقت انتقال۔

اب جب کہ میں نے چکبست پر تا حد امکان کام مکمل کرنے کا منصوبہ ہاتھ میں لے رکھا ہے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ چکبست کا انتخاب کلام آتش و غالب' جتنا بھی میسر آ سکا' شائع کردیا جائے۔ اتفاق سے اس انتخاب پر چکبست کے خیالات "صبح امید" کے اکتوبر کے شمارے میں موجود ہیں' میں نے آخری سطروں میں بہت معمولی ردوبدل سے قطع نظر ان خیالات کو جوں کا توں دیباچے کے طور پر شامل کر لیا ہے۔" اس دیباچے میں ہم کو رضا کے مافی الضمیر کا پتہ چلتا ہے' جو وہ پنڈت برج نرائن چکبست کے لیے رکھتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھئے کہ رضا نے کتنے محتاط انداز میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔ ایک محقق کی جو شان تحریر ہونی چاہیے' وہ اس میں کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ ماہنامہ صبح امید (لکھنؤ) پر رضا کی نظر یقیناً" قابل رشک ہے۔ پھر انہوں نے انتخاب پر جو روشنی ڈالی ہے' اس سے نہ صرف خود ان کے بلکہ چکبست کے بھی مبلغ علم کا پتہ چلتا ہے۔

غالبیات پر رضا کا کلیشن عالمگیری حیثیت رکھتا ہے۔ آیئے پہلے رضا کی تالیف "دعائے صباح" پر دیباچہ دیکھ لیا جائے۔

دعائے صباح _____ 25 اگست 197ء

دعائے صباح (دعاء الصباح) حضرت علی سے منسوب مجموعہ موسومہ۔
"صحیفہ علویہ" کی ایک مشہور مقبول دعا ہے جسے شیعی حضرات عموماً" صبح کے وقت بعد نماز پڑھتے ہیں۔ مگر اصل ماخذ میں ہے کہ نافلہ کے بعد پڑھی جائے۔(بحوالہ نور "نور

کا تڑکا" ص 10' مولانا سید آغا مہدی 1368ھ) اس دعا کے خوائص اور فضائل سے متعلق مشہور ہے کہ جو شخص اسے جس حاجت کے لیے پڑھے گا اس کی دعا مستجاب ہو گی۔ اس کا پڑھنے والا عام بلاؤں سے محفوظ رہے گا۔ لوگوں کی نگاہ میں معزز اور بزرگ ہوگا۔ اور دشمن اس پر غلبہ نہ پا سکے گا۔ دعا عربی میں ہے اور قرآنی اسلوب بیان کے مطابق ہے' بلکہ اصل عربی میں بہت حد تک قرانی آیات استعمال ہوئی ہیں۔ دعا کا پیرایہ بالکل وہی ہے' جو اصلاحی دعاؤں کا ہوتا ہے۔ یعنی اپنے عجز کا اظہار اور گناہوں سے بچنے کی خواہش۔

یوں تو "دعائے صباح" کی فارسی شرحیں اور ترجمے صدیوں سے ہوتے آئے ہیں' مگر ہمارا موضوع وہ فارسی منظوم ترجمہ ہے جو مرزا غالب نے کیا ہے اور ان کی زندگی میں ان کے بھانجے مرزا عباس بیگ کے ایما پر نول کشور سے طبع ہوا۔

اس اولین ایڈیشن کا آج تک صرف ایک ہی نسخہ معلوم ہے' اور خوش قسمتی سے یہ میرے ہی غالب کلیکشن میں شامل ہے۔ مرزا عباس بیگ 1867ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اور وہ اس وقت لکھنؤ میں متعین تھے۔ ظاہر ہے کہ رسالہ 1867ء میں یا اس سے کچھ پہلے ہو گا۔ کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ رسالہ " حسب الایمائے مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ شائع ہوا۔" رضا لائبریری' رام پور میں بھی ایک قلمی نسخہ موجود ہے' جو 23 رجب 1284ھ (1867ء) کو لکھا گیا تھا۔ (بحوالہ نگار لکھنؤ 1941ء) مگر یہ نسخہ مطبوعہ نول کشور کی نقل ہے۔ لہٰذا تقدم مطبوعہ نسخہ ہی کو حاصل ہے' چنانچہ اس کتاب میں جو "دعائے صباح " مع ترجمہ نثر و نیز ترجمہ منظوم از مرزا اسد اللہ خان غالب شامل ہے۔

مثنوی میں عیوب شاعری کو دیکھتے ہوئے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی غالب کے عہد جوانی سے کچھ پہلے کہی ہوئی ہے۔ ان کے آخری چند برسوں کی دین نہیں۔ کیونکہ اس قسم کے عیوب ان کی ان مثنویوں میں شاذ ہی نکلتے ہیں۔ جو ان کے فارسی دیوان مرتبہ 1835ء میں شامل ہیں' جب کہ ان کی عمر چالیس برس سے کم تھی۔ قیاس ہے کہ اسی رسالے کے چھپنے کے مدتوں پہلے وہ اس مثنوی کو منظوم کر کے بھلا چکے

ہوں گے۔ بظاہر کہیں سے پرانا مسودہ مرزا عباس بیگ کے ہاتھ لگ گیا اور انہوں نے اسے مطبع نول کشور لکھنؤ سے جہاں وہ ایک بڑے سرکاری عہدے پر متمکن تھے' اپنے ایما سے (غالب کی ایما سے نہیں) ثواب کے لیے چھپوا دیا ہو گا۔ رسالے کے سرورق کی عبارت بھی یہی ہے۔ "حسب الایمائے مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ' مطبع منشی نول کشور رونق طبع یافت۔"

رضا صاحب کا یہ مقدمہ نہایت فصیح و بلیغ اور طویل ہے۔ مگر یہاں اسے بہت زیادہ اختصار کے ساتھ دیا جا رہا ہے۔ غالبیات کی کسی ایک مخصوص شاخ پر اس قدر کامل عبور کی' اس دیباچے سے بہتر مثال مشکل سے ہی پیش کی جا سکتی ہے۔ رضا نے اس دیباچے میں زبردست ناقدانہ انداز فکر سے اپنی معلومات فراہم کی ہیں۔

منشورات جوش ملسیانی---28 اپریل 1977ء

"استاذی قبلہ جوش ملسیانی اپنے مکتوب بحوالہ مکتوبات جوش ملسیانی بنام رضا' خط 3 صفحہ 45) مورخہ ستمبر 1950ء میں لکھتے ہیں....

"اب میں دوسرے دیوان کی ترتیب اور اپنے خالص ادبی مضامین کی ترتیب و اشاعت پر متوجہ ہو گیا ہوں' آنے والے موسم سرما میں نثر و نظم کے یہ دونوں مجموعے مرتب کر لینے کی امید رکھتا ہوں' اس کے بعد ان کی اشاعت کا انتظام دہلی ہی میں کروں گا' تنقیدی اور ادبی مضامین کا مجموعہ شاید تین تین سو صفحے کی دو جلدوں میں مرتب ہو۔ تقطیع شرح غالب ہی کی ہو گی۔"

مکتوبات جوش ملسیانی بنام رضا اگست 1976ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کے صفحہ 37 پر برادر معظم جناب عرش ملسیانی انہیں مضامین سے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

"مضامین کے دو مجموعے ترتیب شدہ موجود ہیں۔ لیکن ہنوز شرمندہ اشاعت نہیں ہوئے۔" گویا بیس بائیس سال گزر گئے مگر مرتب شدہ مسودے شائع نہ ہو سکے' حتیٰ کہ 27 جنوری 1976ء کو جوش صاحب کا انتقال ہو گیا۔

"مجھے اس بات کا ہمیشہ قلق رہا' جب دسمبر 1976ء میں دہلی جانا ہوا' تو میں

نے پھر عرش صاحب سے انہیں مجموعہ ہائے مضامین کی اشاعت کی بات چلائی۔ انہوں نے دونوں جلدیں میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے مسودے الٹ پلٹ کر دیکھے اور ان کے ورق ورق پر جوش صاحب کو زندہ اور پائندہ پایا۔ ایک استاد کی ہموار بااصول علمی' ادبی' شعری مگر صاف ستھری زندگی کے تمام نقوش ان جلدوں میں محفوظ پائے' صاف پختہ' نستعلیق خط ہر ورق پر سطروں کی ایک خاص ترتیب ہر صفحے پر نمبر پڑا ہوا۔ آغاز کتاب میں مکمل فہرست مضامین' غرض کہ انہوں نے مجھ ایسے حقیر مئولف کے لیے ایک کام بھی ایسا نہ چھوڑا تھا جسے پورا کر کے میں اپنی شاگردی کا حق ادا کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ جوش صاحب کسی سے خدمت لینا جانتے ہی نہ تھے۔ انہوں نے طویل عمر پائی۔ مگر آخری دم تک اپنا کام اپنے ہاتھ سے کیا' ہاں دوسروں کی خدمت انہوں نے جی جان سے کی' آج ان کے سینکڑوں شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد ان کے اس جذبے کی زندہ نشانیاں ہیں' لہٰذا جہاں جہاں اردو موجود ہے وہاں وہاں احترام سے جوش صاحب کا نام لینے والے بھی موجود ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آج ان مضامین کی پہلی جلد زیور طبع سے آراستہ ہو کر آپ کے سامنے ہے۔ مضمون میں نہایت درجہ اصلیت ہے۔ بناوٹ کہیں پھٹک نہیں گئی ہے۔

رضا صاحب کہتے ہیں کہ "علم وفن کے کتنے ہفت خواں زیر کرنے پڑتے ہیں"۔ یہ بات ہوئی۔ وہ زیر کی جگہ طے بھی تحریر کر سکتے تھے جو کافی مستعمل ہے لیکن طے سے برتری و خلوص نیت کی آئینہ کاری نہ ہو پاتی۔ یہ رضا کا لفظوں پر عبور کا اظہار ہے۔

رضا نے اپنی چند نظموں کا اپنے احباب کے اصرار پر انگریزی زبان میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ اس میں درج شدہ دیباچے کا خاکہ اس طرح ہے۔

سائلینٹ فلیم_____25 اگست 1974ء

"میں کبھی کبھی دوسری زبانوں میں بھی لکھا کرتا ہوں۔ اگرچہ میں ایک اردو شاعر ہوں اور اس زبان میں میرے کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اول الذکر کو مرکزی حکومت نے انعام سے نوازا تھا۔ اور دوسرے مجموعہ کلام کو حکومت

اترپردیش سے انعام مل چکا ہے' یہ مختصر کتاب "سائلینٹ فلیم" میرے نیروبی (کینیا) میں طویل عرصہ تک قیام کے دوران کہے ہوئے اور 1968ء میں ہندوستان میں شائع شدہ مجموعہ کلام "شعلہ خاموش" کی بیشتر نظموں کے ترجمے پر محیط ہیں۔

مذکورہ کتاب شائع ہونے کے بعد میرے احباب کے محبانہ مشورے پر میرا خیال تو یہی تھا کہ پوری کتاب کو انگریزی کے تین سو صفحات پر محیط کروں' لیکن حالات کے دباؤ نے جس میں نئی نظموں کے تحریر کرنے کا بھی جذبہ شامل تھا' مجبور کردیا کہ جو کچھ کم وبیش ترجمہ کیا جاچکا ہے' اسی کو شائع کردیا جائے۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں نظمیات کا ترجمہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایک زبان میں جو کچھ عین فطرتی نظر آتا ہے۔ وہ دوسری زبان میں مصنوعی محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے انگریزی میں ترجے کو کافی حد تک طری بنانے اور اسے زبان کے محاورات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے متعدد ترامیم بھی روا رکھی گئی ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں قطعاً" باک نہیں ہے کہ یہ میری مرغوب ترین نظمیں نہیں ہیں' اس لیے کہ انتخاب کرنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں کیا تھا۔ پھر بھی مجھے امید ہے کہ یہ مختصر ترجمہ جو یہاں حاضر ہے۔ معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ثابت ہوگا۔

رضا نے اپنے مطمع نظر نیز ترجے کی بنیادی دقتوں اور اس کی تکنیک پر واضح نشاندہی کی ہے' نیز اس مخصوص ترجے کی حیثیت اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اردو زبان میں دیباچہ اور اس کے فن کو یہاں انگریزی میں بھی رضا نے قائم کرکے اپنی ادبی حیثیت کا لوہا منوایا ہے' اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں' کہ رضا کی دیباچہ نگاری خود ان کی قوت تخلیق کے مقام کو متعین کرتی ہے۔ ان جملہ دیباچوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں رضا جو کچھ بھی ہیں' وہی ہیں' نہ خارجی بناوٹ نہ ظاہری کا سنگار۔

کچھ ہنگامی کلام

مضمون "رضا صاحب کے کچھ برجستہ اشعار" میں نے بیشتران دستاویزات کی بنا پر تیار کیا تھا جو میرے پاس محفوظ تھیں ان کاغذات میں رضا صاحب کا کچھ اور کلام بھی ہے جو اگرچہ برجستہ کہا ہوا نہیں ہے مگر ہنگامی ہے۔ شاید ان کی نقلیں رضا صاحب کے پاس بھی نہ ہوں گی۔ اس لیے میں اسے یہاں درج کیے دیتا ہوں تاکہ محفوظ ہوجائے اور مشرقی افریقہ کے تعلق سے رضا صاحب کے ابتدائی کلام میں اضافہ ہوسکے۔

رضا صاحب دو اڑھائی سال کے لیے ممباسہ (کینیا کی مشہور بندرگاہ) منتقل ہوگئے تھے۔ وہیں انہیں خبر ملی کہ نواب صدیق علی خان معہ بیگم خورشید صدیق علی خان کمشنر برائے پاکستان واپس پاکستان تشریف لے جارہے ہیں۔ رضا صاحب نواب صاحب کے مرنجان مرنج مزاج کی بنا پر ان کے بڑے دلدادہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً" (اپریل 1955ء) سات شعر کا ایک قطعہ کہہ کر حیدری صاحب کو بھیج دیا۔ اس قطعے اور نواب صاحب کے متعلق دوسری نظم (جس کا ذکر آگے آئے گا) کی نقلیں مجھے حیدری صاحب سے دستیاب ہوئی تھیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔ خیال رہے کہ حیدری صاحب ان دنوں پاکستانی سفارت خانے ہی میں ملازم تھے۔

"شاعری ساز کے ہر تار پر تھراتی تھی"
زندگی نغمے کے ہر سر میں کبھی جاتی تھی
مطمئن چرخ بھی تھا اور فضا بھی خاموش

زندگی ہوش میں تھی اور زمانہ مدہوش
سرد تھی آتش غم، دل میں نہ انگارے تھے
رہبری کو شب دیجور میں دو تارے تھے

چرخ نیلوفری پہ روشن تھے بہت یہ تارے
جگمگاتے تھے انہی تاروں سے منظر سارے

ناگہاں بات سنی چمکیں گے یہ تارے نہ اب
آسماں ٹوٹ پڑا ہوگیا واللہ غضب

دو ہی تو تارے تھے جن سے تھا فلک کا جینا
اے رضا سہل نہیں خون جگر کا پینا

کیا کہوں کون سے کانوں سے سنیں گے احباب
اب نہ بیگم ہی رہیں گی نہ یہاں پر نواب

(2) ایک روز رضا صاحب کو یکایک معلوم ہوا کہ نواب صاحب معہ بیگم صاحبہ کراچی کے لیے بحری جہاز پر سوار ہونے کے لیے ممباسہ تشریف لے آئے ہیں اور ان کی شان میں ایک جلسہ ہونے والا ہے۔ یہ یکم مئی 1955ء کا واقعہ ہے رضا صاحب نے اسی روز ایک نظم کہی اور جلسے میں جا کر سنائی۔

اجازت ہو تو میں بھی داستاں اپنی بیاں کر لوں
بھری محفل کو شعر و شاعری سے راز داں کر لوں

گھڑی یا دو گھڑی کے واسطے جی کا زیاں کر لوں
کچھ اپنی بات کہہ لوں کچھ بیان دوستاں کر لوں

طبیعت شاد ہوتی خوشگوار آج اتنا موسم ہے
مگر اک بات ہے مایوس جس سے ابن آدم ہے

(یہاں سے دو ایک بند غائب ہیں۔ معذرت خواہ ہوں)

یہ وہ نواب ہیں جو رونق محفل رہے برسوں
ادب کی جاں رہے برسوں ادب کا دل رہے برسوں

غرض مندوں کا تھا طوفان یہ ساحل رہے برسوں
غریبوں بے نواؤں کے لیے لنگر رہے برسوں

مگر افسوس ناقدروں نے ان سے بے وفائی کی
نہ کچھ اچھا کیا ان کا نہ اپنی ہی بھلائی کی

مجھے معلوم ہے پبلک کی کیا کی آپ نے خدمت
انہی کے دم قدم سے بزم اردو کی بڑھی شوکت

مجھ ایسے عاصیوں کو نعت کہنے کی ملی برکت
مجھے دی آپ نے عزت خدا نے ان کو دی عزت

مجھے دفتر کی تبدیلی نے ممباسے میں لا پھینکا
گدا کی بھیک ہوں قسمت نے اس کاسے میں لا پھینکا

مگر اس حال میں بھی بھول سکتا میں نہیں ان کو
خدائے عزوجل لے جائے عزت سے کہیں ان کو

بنا رکھے رسول اللہ کے در کا مکیں ان کو
فلک ہو ان کا شیدائی ترقی دے زمیں ان کو

رضا ہوں آمد نواب کا غل سن کے آیا ہوں
عقیدت کے چمن سے پھول یہ دو چن کے لایا ہوں

(3) ممباسہ میں ایک سندھی تاجر روپ لال تھے۔ سخن فہم تھے۔ اس لیے رضا صاحب کے دوست تھے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو انہوں نے بذریعہ خط رضا صاحب کو دعوت نامہ بھیج دیا خود نہ آئے۔ رضا صاحب نے بھی شادی میں شامل نہ ہو کر یہ پانچ شعر کا قطعہ لکھ کر ڈاک میں ارسال کردیا۔ قطعے پر 24 ستمبر 1955ء کی تاریخ پڑی

ہوئی ہے۔

ہوگئی آج روپ کی شادی
گھر کی تعمیر' دل کی آبادی

شہر بھر کو بلایا جا جاکر
ہم کو صرف ایک چٹھی بھجوا دی

چپکے چپکے سے پیار لوٹ لیا
کس سے سیکھی یہ تم نے استادی

تم رہو شاد خوش رہے بیوی
نکتہ شادی میں ہے یہ بنیادی

خوب جوڑا ہے روپ اور کملا
ہو مبارک یہ خانہ آبادی

(4) یہ نامکمل مسدس 20 نومبر 1955ء کا کہا ہوا ہے۔ مگر سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں کہ یہ مولانا چودھری عنایت اللہ صاحب' جو نیروبی میں کسی مسجد کے امام تھے' کی وداعی پارٹی میں پڑھا گیا ہوگا۔

ہم سے آخر دور ہوجانے کا وقت آ ہی گیا
چودھری صاحب کو ہم سے روٹھنا بھا ہی گیا

قلب بے خود لذت عالم سے گھبرا ہی گیا
دل وطن کی یاد بے پایاں سے ٹکرا ہی گیا

آپ کو بس اب پرانے ساتھیوں کی یاد ہے
طائر غربت زدہ اب آشیاں آباد ہے

اکسار اک جوہر خاص آپ کی سیرت کا ہے
عاجزی و فقر موجب آپ کی شہرت کا ہے

آپ سے ملنا ہی باعث قلب کی راحت کا ہے
آپ کی صورت بھی باعث آپ کی عزت کا ہے

داغ سجدہ ہے کہ مہر حق ہے ماتھے پر لگی
ایک درویش مکمل آپ کی ہے زندگی

آپ کو اللہ نے نیکی کا وہ ساغر دیا
جس کی مے سے آپ نے سب کا گلا تر کر دیا

دین احمد کا وفا داری سے دامن بھر دیا
ہر مصیبت کا جواب اس کے بھروسے پر دیا

جس کی رہ تکنے سے دھل جاتے ہیں سب دل کے غبار
جس کی مستی پر ہیں قرباں لاکھوں مستوں کا خمار

آپ جائیں گے مگر ٹھہرے گی شہرت آپ کی
اک بشر بھی تو نہ بھولے گا شرافت آپ کی

شہر نیروبی کو ہے ہر دم ضرورت آپ کی
آپ کا دین' آپ کا رتبہ' شرافت آپ کی

آپ کا اخلاق ہے شہرت عبادت گاہ کی
آپ کی ہستی عنایت ہے رضا اللہ کی

(5) شہر کسمو (KISMU) جھیل وکٹوریا نیانزا کے ساحل پر ہے۔ وہاں میں روزگار کے سلسلے میں چھ سال (1955ء تا 1961ء) رہا۔ اگرچہ اس دوران میں نیروبی اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ مگر بیشتر وقت وہیں کسمو میں گزرتا۔ چند دوستوں نے مل کر ایک "بزم ادب" بھی تشکیل دے لی تھی۔ ریڈیو پر "بزم سخن" نیروبی کے تحت برپا ہونے والے مشاعروں کو سن کر ہم نے کسمو (KISMU) میں آل ایسٹ افریقہ مشاعرہ منعقد کیا۔ جس میں نیروبی کے شاعروں کو اور رضا صاحب کو خاص طور پر مدعو

کیا اور پھر ان کے شایان شان استقبال کیا۔ مشاعرہ ڈاکٹر ایف' سی سودا (جو نہایت اعلیٰ درجے کے سخن فہم تھے) کی صدارت میں کسمو (KISMU) کے ایک کلب ہال میں منعقد ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ رضا صاحب نے آتے ہی یہ قطعے پڑھے اور محفل پر چھا گئے۔

اچھے ہیں یہ پھیلے ہوئے میدان کسمو کے
اچھے ہیں اڑتے ہوئے طوفان کسمو کے
ہے جھیل بہت اچھی' اچھی ہے ہوائیں بھی
اچھے ہیں مگر سب سے انسان کسمو کے

○

انجان کہاں ہیں یہ انجان کسمو کے
دانا سے بھی بہتر ہیں نادان کسمو کے
ہم خاک نشینوں کی توقیر بڑھانے کو
افلاک سے اترے ہیں انسان کسمو کے

○

کہہ اے دل مستانہ افسانہ کسمو کا
ہر حرف ہوا چاہے دیوانہ کسمو کا
ہے دوستوں کی نگری یا شمع سخن فہماں
کیوں کر نہ ہو ہر شاعر پروانہ کسمو کا

○

(6) سہروں کی طرح رضا صاحب سے لوگ کتبے بھی کہلوا کر لے جایا کرتے تھے۔ انہوں نے بہت سے کتبے کہے ان میں سے اکثر مرنے والوں کی قبروں پر نصب بھی ہوں گے۔ میرے کاغذات میں محض دو کتبے محفوظ رہ گئے ہیں۔

پہلا کتبہ جناب محمد لطیف لطیف (اب اسلام آباد پاکستان میں مقیم ہیں) نے

کہلوایا تھا اور جس شخص کا انتقال ہوا تھا وہ اپنے خاندان کا آخری فرد تھا کیونکہ وہ لاولد مرا تھا۔

اے صبا! چلنا ذرا اس راہ سے عزت کے ساتھ
اشک آنکھوں سے رواں کرتے ہوئے، رقت کے ساتھ

دھیمی دھیمی چال سے، آرام سے، شفقت کے ساتھ
مہربانوں، غم گساروں کی طرح، قربت کے ساتھ

اس جگہ پر ناز پروردہ، کئی سینوں کا داغ
سو رہا ہے خانداں کا آخری چشم و چراغ

دوسرا کتبہ رضا صاحب کے دوست ڈاکٹر عبداللہ مرحوم کی والدہ کی قبر کے لیے کہا گیا ہے۔ کاغذ پر درج ہے۔

"مرحومہ حاجن غلام فاطمہ زوجہ حاجی رحیم بخش ولادت 12-10-1896 وفات 27-8-1963"

جو بھی ہفت افلاک پر جا کر ثریا ہوگیا
اشک بھی اس کے لیے ٹپکا تو دریا ہوگیا

واقعی انسان تو قیدی ہے آب و تاب کا
خاک میں جب جا ملا، آزاد دنیا ہوگیا

فاطمہ کو جو فضیلت دی رسول اللہ نے
اے رحیم! اس سے ترا رتبہ بھی دونا ہوگیا

معلوم ہوتا ہے کہ دو شعروں کے بعد دو ایک شعر غائب ہیں۔

(7) یہ نظم مقامی کلب سکھ یونین میں مہاراجہ رنجیت سنگھ ڈے پر پڑھی گئی تھی۔

صدی پہلے بھی تو راوی اسی دھرتی پہ بہتا تھا

جہاں رنجیت سنگھ بچپن میں اپنے گھر میں رہتا تھا

وہ جس پنجاب میں پیدا ہوا کھیلا پھلا پھولا
وہ جس پنجاب میں گھر کی خوشی کے جھولنے جھولا

کسے معلوم تھا وہ اس کا راجہ بننے والا ہے
کسے معلوم تھا وہ گھپ اندھیرے میں اجالا ہے

لڑا وہ اپنی ہمت سے بڑھا وہ اپنی ہمت سے
عدو پرلے کے لشکر کو چڑھا وہ اپنی ہمت سے

وہ ان پڑھ تھا مگر وہ اچھے اچھوں سے بھی سیانا تھا
وہ بدھی مان تھا ہشیار تھا عاقل تھا دانا تھا

وہ جب تک بھی رہا زندہ رہا اک بادشا ہوکر
عدو ہو تو بہت جابر نہیں تو باصفا ہوکر

مہاراجہ تھا وہ پنجاب کے یہ گیت کہتے ہیں
بہت جیتے تھے رن اس نے اسے رنجیت کہتے ہیں

(8) مومن علی حیدری ملازمت سے رٹائر ہوکر مارچ 1964ء میں پاکستان چلے گئے اور وہیں جہلم شہر میں دو ایک سال بعد انتقال کیا۔ یہ قطعہ شاید وداعیے کے طور پر پڑھا گیا ہوگا نظم بھی کہی ہوگی مگر وہ اب دستیاب نہیں۔ کاغذ پر 19 مارچ 1964ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔ رضا صاحب کے خاص دوستوں میں تھے۔

آپ برتر تھے رہی حاصل ہمیشہ برتری
دوست کیسے، آپ کو کہیے مجسم برتری

رونق محفل نہیں تھے، جان محفل آپ تھے
اب رہے گی یاد ہی سے شعر کی محفل بھری

آپ کی کیا کیا ہے نسبت آپ کو کیا کیا کہوں

جعفری' عبد علی' شرعی' حسینی' حیدری

(9) سید فدا حسین پاکستان کمیشن میں سیکنڈ سکریٹری تھے۔ شعر و سخن کے دلدادہ اور مدد پر ہمہ وقت آمادہ۔ چند ہی مہینوں میں آپ خاصے مقبول ہو گئے۔ مذہب اثنا عشری تھا نیروبی میں اس جماعت کے امیر ان دنوں مولوی امیر حسن صاحب نجفی تھے۔ فدا حسین صاحب کا تبادلہ یک بیک ہو گیا۔ 28 اگست 1965ء کو ان کے اعزاز میں مولوی امیر حسن صاحب نے ایک محفل اپنے دولت کدے پر رکھی۔ یہ قطعے اسی موقع کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ مولوی امیر صاحب کا اب انتقال ہو چکا ہے۔

ہم فدا صاحب کا جانا سن کے حیراں ہو گئے
آپ کے جانے کے اتنے جلد ساماں ہو گئے؟

آپ کی ہر دل عزیزی رنگ لائی اس طرح
دل میں آئے' دل میں بیٹھے' دل میں مہماں ہو گئے

بے اختیار کہہ اٹھے ہیں مولوی امیر
کیوں جاتے ہیں یہاں سے فدا ہم کو چھوڑ کر

سب مومنوں کے دل میں رہے الفت حسین
دائم فدا حسین ہوں عاشق حسین پر

(10) رضا صاحب کے آخری ایام میں یعنی جس کے دو مہینے بعد وہ مشرقی افریقہ کو خیرباد کہہ کر ہمیشہ کے لیے ہندوستان کے ہو رہے' گورونانک دیوجی کا پانچ سوواں دن نیروبی میں بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ 20 نومبر 1969ء کو نیروبی ساؤتھ سی کے وسیع میدانوں میں جہاں اب عمارتیں ہی عمارتیں تعمیر ہو گئی ہیں۔ شاندار پنڈال کھڑے کیے گئے تھے۔ وہیں اردو شاعروں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس میں رضا صاحب نے اپنی نظم نو قطعوں کی شکل میں (بند کی شکل میں نہیں) سنائی تھی' جو ایسی رواں دواں ہے کہ پڑھتے ہی بنتی ہے۔

پانچ سوواں گرونانک ڈے

ہزاروں میل کی دوری پہ نیروبی کی نگری میں
سبب کیا ہے کہ نانک ڈے پہ ہر انساں سنورتا ہے
کہاں کے پانچ سو' لاکھوں برس دنیا منائے گی
دلوں کا بادشہ جو ہو وہ یاد آیا ہی کرتا ہے

○

نہاں جو جو خزانے ہیں گرونانک کے دامن میں
اجازت ہو تو میں کچھ ان کے بارے میں بیاں کرلوں
طبیعت شاد ہے' جی چاہتا ہے آج رہ رہ کر
بھری محفل کو شعرو شاعری سے رازداں کرلوں

○

جسے پنجاب کہتے ہیں وہاں پرگٹ ہوئے نانک
جسے سنسار کہتے ہیں وہی نانک کی دھرتی ہے
فقیروں نے جسے چاہا وہی ہے دیس نانک کا
جہاں انسان رہتے ہیں وہی نانک کی دھرتی ہے

○

گریباں میں کوئی منہ ڈال کر دیکھے کہ گرونانک
غریبوں بے نواؤں کے لیے بسمل ہوئے کیا کیا
ریا کاروں کا جب سیلاب امڈ آیا تھا بھارت میں
یہ کر ڈوبتوں کے واسطے ساحل ہوئے کیا کیا

○

بہت پیار تھا نانک کو بہم ملنا محبت سے
مگر ہم نے کہاں تک پیار کو دل میں سمویا ہے
کہاں تک بے قراروں کو عطا کی شانتی ہم نے

کہاں تک من کی بھومی میں خوشی کا بیج بویا ہے

○

مرے دل سے کوئی نانک کی شان وبرتری پوچھے
خدائی سیپ میں اک گیان کا موتی کہو ان کو
کہو ان کو مہایوگی، مہا گیانی، مہا دھیانی
مہارشیوں کے من کے آنکھ کی جیوتی کہو ان کو

○

چلو اے کینیا کے باسیو نانک کی چوکھٹ پر
کہ اس در پر دل غمناک کو تسکین ملتی ہے
بڑھو اے کینیا کے باسیو نانک کے گلشن کو
کہ اس گلزار میں آکر کلی ہر دل کی کھلتی ہے

○

گرا ہے آج اک عالم گرونانک کے چرنوں میں
جھکی ہے آج اک دنیا گرونانک کے چرنوں میں
رضا کب تک اکڑ کر دہر میں چلتے رہو گے تم
جھکا دو تم بھی سیس اپنا گرونانک کے چرنوں میں

○

بسی ہے جس میں ہر چھوٹے بڑے کے پیار کی بستی
وہ نانک کا امر پیغام زندہ باد زندہ باد
اٹھو اے ساتھیو! اے دل کی خوشیاں چاہنے والو!
کہو سب مل کے نانک نام زندہ باد زندہ باد

○

(11) محسن علی شاہ صاحب (مسٹر ایس، ایم علی) رضا صاحب کے بہت گہرے

دوست تھے۔ اب بھی خدا کے فضل سے بقید حیات ہیں۔ بیوی کا نام مسز قدرت علی تھا۔ بیٹی کا صبیحہ۔ بیٹا اقتدار، دولہا بنا تو عابدہ دلہن قرار پائی۔ رضا صاحب کچھ ماہ پہلے ہندوستان آچکے تھے۔ محسن علی شاہ صاحب نے انہیں اس ہونے والی شادی کی خبر دی۔ رضا صاحب نے جواب میں یہ قطعہ لکھ کر بھیج دیا۔

اب نہ منزل سے ٹلیں گے اقتدار و عابدہ
ہر قدم مل کے چلیں گے اقتدار و عابدہ

محسن و قدرت کو یاد آجائے گا اپنا شباب
غازہ جب منہ پر ملیں گے اقتدار و عابدہ

کہہ رہے ہیں پھول سہرے کے بلند آواز سے
عمر بھر پھولے پھلیں گے اقتدار و عابدہ

گا رہی ہے یہ صبیحہ بھی بصد ناز و نیاز
میری آنکھوں میں پلیں گے اقتدار و عابدہ

(12) نیروبی میں کوکنی مسلم لائبریری ہال تعمیر ہوا تو میں نے رضا صاحب سے درخواست کی کہ اس پر کچھ کہیے۔ انہوں نے فوراً بمبئی سے ذیل کا قطعہ لکھ بھیجا گویا مشرقی افریقہ (خاص کر نیروبی کینیا) سے متعلق رضا صاحب کا یہ آخری منظومہ ہے۔

کوکنی مسلم لائبریری ہال

کوکنی مسلم ادارہ ہی نہیں
ہر جواں ہر پیر کی امید ہے

پائیداری میں کوئی اور انجمن
ماہ ہوگی، یہ مگر خورشید ہے

کوئی اس کو لاکھ سمجھے خاردار

میری نظروں میں فقط تردید ہے

پھول ہی پھول اس میں ہیں میرے لیے
اپنا اپنا یہ شعور دید ہے

مٹھی بھر لوگوں کا ذہنی اتحاد
لائق تحسین و صد تقلید ہے

کوئی ہال اک تقاضہ وقت کا
اچھے کاموں کی یہ اک تمہید ہے

ہے رضا بھی خوش انہیں خوش دیکھ کر
شعر میرا وقت کی تائید ہے

❄

رضا صاحب بنام ساحر

غالباً 1961ء کی بات ہے۔ میری عمر یہی پچیس سال کی ہوگی۔ میں ان دنوں کسمو میں رہتا تھا۔ وہاں ہم نے ایک بزم شعر منعقد کی۔ نیروبی سے دوسرے شاعروں کے علاوہ وہاں کے نامور شاعر رضا صاحب کو بھی خاص طور پر مدعو کیا۔ وہیں میں نے پہلے پہل رضا صاحب کی رہنمائی حاصل کی۔ خط و کتابت کے ذریعے اصلاح کا سلسلہ دو ایک ہی سال ہی رہا کیونکہ اس کے بعد میں نے خود نیروبی کو اپنا مستقر بنا لیا اور وہاں تقریباً" ہر روز رضا صاحب کے نیاز حاصل رہے اس لیے اس زمانے یعنی 1964ء سے 1969ء تک رضا صاحب کا کوئی خط میرے پاس نہیں ہے۔ 1962ء اور 1963ء کے چند خط البتہ میری تحویل میں رہ گئے ہیں، انہی سے اس مضمون کی شروعات کر رہا ہوں۔

رضا صاحب خطوط میں علمی ادبی نکتے بہت کم بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ سب باتیں اصلاح سخن کے دوران میں حاشیوں پر درج رہا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی میری دلجوئی کے لیے اپنے تازہ اشعار بھی لکھ دیتے تھے مگر بہت کم کیونکہ ان کے مزاج میں خودنمائی کا مادہ کم سے کم ہے۔ صاف سیدھے لفظوں میں بات بیان کر دینا ان کا معمول ہے۔ پہلے خط کا آغاز اس طرح کرتے تھے ؎

ساحر میاں، میاں ساحر، ساحر صاحب، کرم گستر،
عزیزم ساحر، محبی، عزیز من، محب مکرم وغیرہ

اب چند سالوں سے شاید ہزاروں کوس کے فاصلے کی وجہ سے طرفین میں ارتباط بہت بڑھ گیا ہے۔ اب پیارے ساحر۔ بہت ہی پیارے ساحر کے القاب سے یاد فرماتے ہیں جو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ رضا صاحب نہایت خوش دل اور کشادہ خاطر انسان ہیں۔

ان کے خطوط سے بھی یہی نیکی اور شرافت ٹپکتی ہے۔

میرے ریکارڈ میں اصلاحات تو بہت سی ہیں مگر خط بہت کم محفوظ رہ سکے ہیں تاہم انہی خطوط سے چند اقتسابات پیش خدمت ہیں۔ جب میں نے پہلی غزل اصلاح کے لیے بھیجی تو اگست 1962ء کے اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

''تمہارا خط ملا۔ ایک غزل بھی۔ طول وطویل یعنی دو غزلوں کے برابر۔ مطلب کہنے کا یہ کہ غزل میں بارہ تیرہ شعروں سے زیادہ نہ کہو مگر جو کہو سوچ سمجھ کے کہو۔ غزل ترمیم وتنسیخ کے بعد اسی خط کے ساتھ لف ہے اصلاح بہت ہوئی ہے۔ کاغذ پر کافی جگہ چھوڑی ہوئی نہیں تھی، اس لیے وجہ اصلاح کچھ زیادہ تفصیل سے نہ لکھ سکا۔

15 اگست 1962ء کے خط سے اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''تمہاری رباعیاں بعد ترمیم وتنسیخ واپس بھیج رہا ہوں۔ چونکہ رباعی گوئی میں تم ابھی نومشق ہو اس لیے یقیناً یہ قطع وبرید تمہیں پسند نہ ہوگی۔ اصلاح کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ان سے بہت کچھ استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ کیا ڈاکٹر سود صاحب کو ان کی اصلاح شدہ نظمیں مل گئی تھیں۔''

27 اگست 1962ء کو ایک مشاعرے کی خبر دی ہے۔

''ابھی ابھی آپ کی غزلیں اصلاح کے لیے موصول ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ آپ دو تین ستمبر کو نیروبی تشریف لا رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر یکم ستمبر کو نیروبی آجائیں۔ یہاں اسی شام کو میلاد النبیؐ پر ایک مشاعرہ ہو رہا ہے۔ سننے والے اصحاب اچھے ہوں گے مصرع طرح پر فکر کریں ؎

حضور آئے ہیں دنیا میں رہبری کے لیے

رہبری، زندگی وغیرہ قافیے'' کے لیے'' ردیف۔ میں آپ کا منتظر رہوں گا۔ چونکہ وقت بہت کم ہے اس لیے اصلاحات روانہ نہ کرسکوں گا۔ باقی بہ شرط ملاقات نیروبی میں یکم ستمبر کو''۔

6 ستمبر 1963ء۔

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ آپ کی غزلیں بعد حک واصلاح بھیج رہا ہوں ایک

دو نظمیں اور ہیں مگر عدیم الفرصت ہونے کی وجہ سے چند روز بعد دیکھ سکوں گا۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں آپ اور غزلیں اصلاح کے لیے نہ بھیجیں۔ ضرور بھیجیں۔ میں حتی الوسع آپ کی خدمت سے گریز نہ کروں گا۔ عرض ہے کہ میری عدیم الفرصتی کو میری گستاخی پر محمول نہ کریں۔ حیدری صاحب کے لڑکے عزیز محسن علی کی شادی پر سہرا تو کہہ ہی رہے ہوں گے۔ آتے ہوئے بیس بائیس شعر سہرے کے اور لیتے آئیں کیونکہ دوسرے حضرات مجھ سے مانگ رہے ہیں اور میرے پاس وقت نہیں۔ عاقلاں را اشارہ بس است"۔

اب ایک خط میں رضا صاحب کی محبت بھری خفگی بھی ملاحظہ کریں۔ یہ خط 19 دسمبر 1963ء کو لکھا گیا تھا۔

مشاعرہ اور احورو کے فوراً بعد مجھے دارالسلام جانا پڑا۔ وہاں سے آج ہی واپس آیا ہوں۔ مجھے آپ سے سخت شکایت ہے کہ آپ نے باوجود وعدہ کے ہمارے گھر یا ریڈیو اسٹیشن پر چھ بجے تک پہنچنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ مجھے اس میں خاص خفت اٹھانی پڑی کیونکہ میں نے آپ کو خاص طور پر اس مشاعرے میں مدعو کیا تھا اور اس مشاعرے کا سارا بار میرے سر پر تھا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ، عاشق صاحب اور آغا صاحب کیوں اپنے فرض کو بھول گئے۔ ہم سب ایک گھنٹے تک آپ کا انتظار کرتے رہے۔ چھ بجے کے بجائے سات بجے ریکارڈنگ شروع کرائی۔ مجھے بہت شرمندہ ہونا پڑا۔ چونکہ میں آپ کو اپنے مخلصوں میں سمجھتا ہوں اس لیے مجھے یہ شکایت صرف آپ سے ہے اوروں سے نہیں۔

ضیاء الدین ضیاء صاحب نے لکھا تھا کہ ؎

"مشاعروں میں ساحر شیوی صاحب کو بھی شامل کرلیا کریں۔ اب انہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ قصور ساحر کا ہے میرا نہیں"۔

بیس سال سے زیادہ مدت گزار کر رضا صاحب 1970ء میں واپس ہندوستان کو پلٹ آئے۔ میں نے پھر خط و کتابت کے ذریعے اصلاح لینی شروع کردی۔ دہلی کے پتے کے ساتھ مسوری (صحت افزا پہاڑی مقام) سے اپنے 14 جون 1970ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

''دلی کی سخت گرمی اور بیماری سے تنگ آ کر مسوری کی ٹھنڈی اور خوشگوار آب وہوا میں آ گیا ہوں۔ یہ خط وہیں سے لکھ رہا ہوں 23 ۔جون کو واپس دلی جاؤں گا یہاں بھی آ کر سب بیمار ہوگئے۔ نہ جانے یہ بدقسمتی میرے حصے میں کیوں آئی بہر حال پر ماتما کا شکر ہے کہ سب روبصحت ہو رہے ہیں۔ بہت دفعہ سوچا کہ کم از کم آپ کے خط کا جواب تو دے ہی دوں مگر غزلوں کی اصلاح پر توجہ نہ دے سکا اب کہیں یہ کام پورا ہوا ہے اور آپ کی غزلیں بعد اصلاح لوٹا رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کے نیروبی واپس جانے سے پہلے ہی آپ کو میرا یہ مراسلہ موصول ہوجائے گا''۔ ''شورش پنہاں'' کے پروف دیکھ رہا ہوں۔ غالباً اگست میں منظر عام پر آجائے گی۔ دو ایک تازہ رباعیاں سنیے ؎

ہم حال کی پیروی سے ٹل جائیں گے
مستقبل کی صدا میں ڈھل جائیں گے
تم وقت کے ہمراہ نہ پاؤ گے ہمیں
ہم وقت سے کچھ آگے نکل جائیں گے

•••

''اونچا اور اونچا'' کی لذت کب تک
''نیچا'' کہلانے سے نفرت کب تک
اے انسان اے فقیر اے سنیاسی!
اورنگ فضیلت سے محبت کب تک

خط مورخہ 3 دسمبر 1970ء

سب سے پہلے تو یہ بتائیے کہ اب صفیہ کا کیا حال ہے۔ سخت تشویش ہو رہی ہے اور کس معاملے میں اسے ہسپتال لے جانا پڑا۔ بزنس کا حال کیوں ٹھیک نہیں ہے۔ اگر آپ کو ہندوستان آ کر رہنا ہو تو بندہ خدمت کے لیے حاضر ہے۔ فکر نہ کرنا کوئی صورت نکل آئے گی۔ فکرت عربی ہے جس کے معنی فکر ہی کے ہوتے ہیں۔ رشک لکھنوی کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

آئے دقت پر جو میری فکرت نازک پسند

ہو ابھی پانی سے پتلا قافیہ دولاب کا

فکرت کو قلت کے ساتھ ،وہ بھی ترکیب میں،استعمال کرتے ہیں۔کیا آپ نے ''شورش پنہاں'' جہاں جہاں میں نے لکھا تھا تقسیم کردی ہے۔

خط مورخہ 25 اپریل 1971ء

''میں بھی لگ بھگ ڈیڑھ ماہ بیماری کے چنگل میں رہا ۔اب کہیں ہفتہ عشرہ سے ٹھیک ہوں۔مجھے آپ کے حالات پڑھ کر دھکا سا لگا۔کمبخت فاصلہ سد راہ ہے ورنہ آپ کے مصائب میں شریک ہوتا۔مشکل وقت میں ہمدرد ہونا بھی تو راحت رساں ہوتا ہے۔مجھ سے تو وہ بھی نہ ہوا۔غزل بعد اصلاح ارسال ہے۔اشعار اچھے ہیں۔امید ہے کہ اب تک آپ مع عزیزہ صفیہ بالکل شفا یاب ہو چکے ہوں گے۔پچھلے دنوں جمال صاحب کی ''رعنائی جمال'' کا ایک نسخہ ملا۔مطالعہ کیا، بے شمار اغلاط نظر آئیں۔یقیناً بازار شعر میں یہ کتاب بہت سستے داموں فروخت ہوگی''۔تازہ کلام کچھ نہیں دو چار شعر لکھے دیتا ہوں ؎

جانے کس الجھن میں پڑا ہوں
ڈوبا سا ساحل پہ کھڑا ہوں

ہمدردی کا آنسو ہوں میں
ہیرا سا آنکھوں میں جڑا ہوں

میرا بڑا پن رضا نہ جانے
چھوٹی سمجھ سے بہت بڑا ہوں

خط مورخہ 5 جون 1971ء

غزل بعد حک و اصلاح واپس ہے۔کلام سے بے حد افسردگی ٹپکتی ہے۔میری سمجھ میں نہیں آتا ،کیا کروں کیا نہ کروں۔اگر آپ ہندوستان میں ہوتے تو حتی المقدور غمگساری کرتا مگر آپ ٹہرے کہیں اور۔حاجی صاحب نے نہ جانے کس مصلحت پر ہندوستان کو اپنا ملجا و ماوا نہیں بنایا۔اگر وہ ہندوستان میں آ کر رہ جاتے تو

کتنا اچھا ہوتا۔ یہ ملک باوجود اپنی کوتاہیوں کے ہندو مسلمان دونوں کے لیے بہشت ہے۔ بہر حال جو مشاعرہ آپ نے مجھ ناچیز کی عزت میں سر علی مسلم کلب میں کیا تھا اس میں میں نے کچھ قطعات پڑھے تھے اس کی کاپی میرے پاس نہیں ہے۔ اگر آپ کے پاس یا عاصی صاحب کے پاس ہو تو مجھے بہم پہنچائیں ضرورت ہے۔ ایک رباعی آپ کے لیے کہی ہے ؂

غم سے ملے راحت یہ کہاں ممکن ہے
نالوں سے فقط جی کا زیاں ممکن ہے
کوشش کرو ہنس ہنس کے جیئے جانے کی
خوش حال، طربناک جہاں ممکن ہے

خط مورخہ 8 جولائی 1974ء

"آپ کا خط مع کلام برائے اصلاح ملے ہوئے بہت روز ہو گئے۔ چونکہ اشعار کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس لیے کئی قسطوں میں دیکھ سکا ہوں اور بعد اصلاح سب کلام واپس ارسال کر رہا ہوں۔ کچھ دیر اس لیے بھی لگی کہ لطیف صاحب جو آج کل پاکستان میں ہیں، ہر ہفتے عشرے کے بعد ایک پلندہ اپنی پرانی غزلوں نظموں کا برائے اصلاح بھیج دیتے ہیں چونکہ آپ ہی کی طرح میں ان کو بھی بہت عزیز رکھتا ہوں ،اس لیے ان کا دل رکھنا بھی مجھ پر فرض ہے۔ بڑے محبت والے انسان ہیں۔ اپنا مجموعہ کلام چھپوانے کی فکر میں ہیں ،اس لیے میں ان کے کلام میں قطع و برید بہت کرتا ہوں۔ شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ خود میں نے اپنے کلام پر چھپوانے سے پہلے بہت سختی سے چھری چلائی تھی۔ شاعر کے لیے یہ حوصلہ مندی بہت ضروری اور مفید ہوتی ہے۔ کیا آپ کو میرا تیسرا مجموعہ کلام "شاخِ گل" ملا۔ ہوائی ڈاک سے بھجوایا تھا۔ آپ کا ایک مقطع ہے ؂

بزمِ کملا میں آج اے ساحر
ہم سخن ہوں گے ہم نوا ہوں گے

یہ کملا کون ہے۔ ایک مسز کملا علی کا کچھ کلام میں نے بھی تصحیح کر کے "صبح امید" میں چھپوایا تھا۔ عزیزی عبدالسمیع نے مجھے اصلاح کے لیے دیا تھا۔ شاید یہ کملا

وہی ہو۔کیا عاشق صاحب اور عاصی صاحب وہیں نیر دبی ہی میں ہیں ۔میں انہیں بھی ''شاخ گل '' بھجوانا چاہتا ہوں ۔اگر ہو تو ایڈریس بھجوایئے۔

آپ ہر خط میں اپنی مجبوریوں کا ذکر کرتے ہیں، وہ مجبوریاں کیا ہیں۔جب تک آپ کھل کر نہ لکھیں گے میں آپ کی مدد کرنے سے قاصر رہوں گا۔بہر حال مجھے اس بات نے ملول کیا کہ آپ وہاں خوش نہیں ہیں۔پرسان حال کو بندگی۔ بچوں کو پیار۔

Nation میں میری تصویر اور انعام کی خبر کس نے چھپوائی تھی۔ بہت سے خطوط مجھے مبارک باد کے ملے ہیں۔میں نے اپنی عادت کے مطابق، یہ خبر یہاں سے کسی کو نہیں دی''۔

مورخہ 6 اکتوبر 1977ء

''کلام کی تصحیح اس لیے جلد نہ ہو سکی کہ میں ٹائیفائد سے مہینہ بھر بیمار رہا پھر ٹائیفائڈ کی کمزوری تو معلوم ہی ہے۔حتیٰ کہ آج تک پورے طور پر صحت یاب نہیں ہو سکا۔اصلاح شدہ کلام واپس ہے۔ترمیم و تنسیخ دیوان کی اشاعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذرا زیادہ سختی سے کی ہے۔غزلیں یہی آٹھ نو اشعار سے زیادہ کی کہا کریں۔ یا اگر کہیں تو اصلاح کے لیے ان میں سے چن کر آٹھ دس اشعار بھیجا کریں ۔جب تک خود شعر کہہ کر پرکھنے کی عادت نہ پڑے گی ،حوصلہ نہیں بڑھے گا اور یقین پیدا نہیں ہوگا۔

وی آر نبیل جسٹس چانن سنگھ کے انتقال کی خبر مجھے مل گئی تھی۔ان کے گزر جانے سے گویا میری زندگی کا ایک حصہ ان کے ساتھ چلا گیا۔ایسا عالم شخص کم ہی دیکھنے سننے میں آتا ہے۔میری کتاب ''ہندوستانی مشرقی افریقہ میں'' کی جلد اول اب پریس میں ہے۔دوسرا حصہ جس میں مشرقی افریقہ میں اردو ادب کا پورا بیان ہے لکھا جا رہا ہے، بھی جلد شائع ہوگا۔

جسٹس چانن سنگھ کی یاد میں کیے گئے مشاعرے کا حال لکھیں ۔آپ کا مطلع بے باک، اخلاق کا قافیہ لیے ہوئے ہے۔اسے آپ نے کیونکر جائز رکھا''۔

خط مورخہ 19 مئی 1978ء

16 اکتوبر 7 197 کو آپ کا تمام کلام حک و اصلاح کے بعد رجسٹرڈ پوسٹ سے ارسال کیا تھا مگر آج تک رسید کا خط نہیں ملا۔ پھر ''ہندوستانی مشرقی افریقہ میں ''اور ''دعائے صباح'' آپ کو محسن علی شاہ صاحب کے ذریعے بھیجیں ان کی بھی رسید نہیں۔

آپ کو لکھا تھا کہ ''ہندوستانی مشرقی افریقہ میں'' جلد دوم جس میں صرف اردو کی ترقی و ترویج (مشرقی افریقہ میں) ہی کا ذکر ہوگا لکھی جارہی ہے۔ اس کا تعارف آپ کو لکھنا ہے۔ آپ نے میرے ساتھ بہت وقت گزارا ہے اور بہت سی یادداشتیں آپ کے پاس ہوں گی۔

سنا ہے حیدری صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ کہاں اور کب۔ مرزا جی آج کل کیا کر رہے ہیں۔ عاشق صاحب کہاں ہیں۔ مجی ظفر اللہ عاصی کے سوا آج کل اردو کے اور کون کون سے شاعر وہاں موجود ہیں۔ یہ اطلاعات بہم پہنچائیں۔

آپ کے پاس ''شورش پنہاں'' کی کچھ کاپیاں پڑی ہوں گی۔ اگر ہوں تو پہلی فرصت میں واپس بھجوادیں۔ یہاں اب ''شعلہ خاموش'' اور ''شورش پنہاں'' کی کوئی جلد دستیاب نہیں۔ ان سب باتوں کا جواب فوراً دیں۔ یو پی اردو اکیڈمی نے ''ہندوستانی مشرقی افریقہ میں'' پر انعام دیا ہے۔

خط مورخہ 18 مارچ 1982ء

آپکی بیاض کی اصلاح شروع کر دی ہے۔ یہ خط میں پونا سے لکھ رہا ہوں۔ مجموعہ کلام چھپنے سے پہلے ایک نظر اور دیکھ لینا چاہیے۔ آپ نے ٹیبل کلاک بہت خوبصورت بھیجا، بھائی، ایسے قیمتی تحفوں کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو فقیر آدمی ہوں ہر حال میں مطمئن ہوں۔ ع: وقت کٹتا ہے یونہی، عمر بسر ہوتی ہے۔ اصلاح ذرا سختی سے کی ہے۔ اس کا پھل میٹھا ہوگا۔ خاور اب ایک مدت سے اپنا کلام اصلاح کے لیے نہیں بھیجتے۔ انہوں نے آپ سے شکایت کی تھی کہ اصلاح کلام میں رضا صاحب بہت سخت گیر ہیں۔ شاید یہی وجہ ان کی کلام برائے اصلاح نہ بھیجنے کی ہوگی۔ کلام اور مجموعہ ہائے کلام کی اصلاح کے لیے لوگ دور دور سے بہت سا کلام بھیج دیتے

ہیں۔اتنا وقت نہیں ہوتا۔کبھی کبھی مسودہ خاص طور پر جبکہ کلام بیاض کی شکل میں ہو،لوٹا دینا پڑتا ہے۔مگر آپ کے لیے ایسی کوئی شرط نہیں۔آپ جتنا کلام چاہیں بھیجیں مگر خدارا یہ نہ کہیں کہ یہ آپ کا آخری کلام ہے۔آپ کو ابھی بہت زندہ رہنا ہے۔آپ انشااللہ حالیہ امتحان سے بخوبی گزر جائیں گے۔

اب اگر کوئی اصلاحی کام فوراً نپٹادوں تو نپٹادوں ورنہ پڑا رہ جاتا ہے۔مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔مالی اور ذہنی پریشانیاں اس پر مستزاد۔جتنا بڑا کاروبار اتنی بڑی پریشانی"۔

خط مورخہ 12 مئی 1982ء

ابھی ابھی آپ کی رباعیاں ختم کیں۔تعداد زیادہ تھی۔چونکہ میرا رباعی گوئی کا معیار ذرا اونچا ہے اس لیے ان رباعیوں کی اصلاح عجلت میں کرنا گوارا نہ ہوا۔بیس اکیس رباعیاں قلم زد ہوگئیں،مگر،باقی ماندہ خوب چست اور بامعنی ہوگئی ہیں۔بھائی ،آپ کتاب میرے نام انتساب کرنا چاہتے ہیں۔یہ آپ کی سعادت مندی اور ذرہ نوازی ہے۔اس بات سے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ آپ کی صحت اب اچھی ہے، پرماتما اچھی رکھے۔آپ میری کیا پوچھتے ہیں۔دوستوں کے کرم سے مجھ پر یہاں انکم ٹیکس کا چھاپا پڑا۔سب راستے آمدنی کے مسدود ہوگئے۔بہت حسرت میں دن گزارے لیکن پرماتما کے سوائے آج تک کسی سے مدد نہیں مانگی۔اب بھی نہیں مانگوں گا۔

میں بھی مٹنے کا نہیں دست کرم رکھتا ہوں
تو بھی اے دست ستمگار، ستم کرتا جا

ایسے میں صحت کہاں رہتی۔لوگ اب بھی کروڑ پتی مانے ہوئے ہیں۔مانے رہیں۔ان کا شکریہ۔گھر میں گوشہ نشیں ہوگیا ہوں۔

دیوان غالب (تاریخی ترتیب سے) مرتب کر چکا ہوں۔غالب نے اپنے صرف 1802 شعر منتخب کیے تھے۔اس دیوان میں 4000 سے زائد شعر ہوں گے اور 100 صفحوں کا مقدمہ ہوگا۔غالب کا کیا کہنا۔اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔بیا وربد گرایں جا بود زباں دانے"۔

خط مورخہ 19 جون 1987ء

آپ کا ہولناک خط کل ملا تھا۔ آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا اسے پڑھ کر تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ پر ماتما آپ کو لمبی عمر دے اور اپنے عیال واطفال میں تادیر خوشیاں بکھیرنے کے لیے زندہ رکھے۔ اگرچہ اس حادثے میں مالی نقصان بھی بہت ہوگیا پھر بھی جان بچی لاکھوں پائے۔ امید ہے اب ٹانکے کھل گئے ہوں گے اور آپ ہشاش بشاش ہوں گے۔ ساوتری اور میری دونوں کی طرف سے آپ کو، آپ کی بیگم اور بچوں کو بہت سا پیار۔

یہ خط لکھ ہی رہا تھا کہ آپ کی مرسلہ کتابیں (5 جلدیں) بھی آ گئیں۔ کتاب بہت اچھی چھپی ہے۔

شروع میں ڈاکٹر مظفر حنفی کا پیش لفظ ہے۔ اس میں ان زبان وبیان کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرنا اچھا نہیں لگا۔ جہاں تک دو شعروں کے ناپسند ہونے کا سوال ہے وہ تو کوئی بات نہیں مگر تین مصرعوں میں، جنہیں حنفی صاحب نے ''اکھڑی اکھڑی زبان میں ہانپتے ہوئے مصرعے'' اور ''فنی اور لسانی تسامحات کہا ہے، مجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی۔

ہائے اس کی مٹک چال میرا کیا ہوگا

مٹک چال ناز نخرے کی چال کو کہتے ہیں۔ نور اللغات دیکھ لیجیے ؎

مجھ کو جنوں کا سارا اثاثہ سنبھال کر

یعنی میری حفاظت میں دے کر۔ مہذب اللغات میں یہ جملہ ملتا ہے۔ ''لو روپیہ سنبھالو'' یعنی روپیہ اپنی حفاظت میں لے لو۔

اب ہمارے بھی پاس پیسا ہے

یعنی ہمارے پاس بھی پیسا ہے۔ ایسی تنقید لفظی کس کے یہاں نہیں۔ غالب کہتا ہے۔

آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

یعنی دم تحریر کوئی ہمارا آدمی بھی تھا۔

بچیوں کی شادی پر بہت سی مبارک باد۔ یہ تو بہت خوشی کا مقام ہے۔ آپ نے میرے وہاں پہنچنے پر اصرار کیا ہے۔ کاش میں ایسا کر سکتا۔ مکروہات زمانہ نے ایسا

گھیر رکھا ہے کہ کیا کہوں۔ بوڑھا اور جسمانی و ذہنی طور پر تیزی سے مفلوج ہو رہا ہوں۔ بس دو تین سال میں غالب پروجیکٹ مکمل ہو جائے تو یہ بہت ہوگا۔ ابھی حال ہی میں دیوان غالب (1841ء کا عکسی ایڈیشن) اور دیوان غالب (1862ء کا عکسی ایڈیشن) مبسوط مقدموں کے ساتھ شائع کیے ہیں۔ دیوان غالب (کامل) جو ایک بڑا کام ہے، پریس میں ہے۔ اس کے بعد شرح دیوان غالب (کامل) چار جلدوں میں لکھنے اور شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ پرماتما توفیق دے تو یہ کام بھی پورا کرلوں۔ آپ نے جس محبت اور احترام سے اپنے خط میں اور کتاب میں میرا ذکر کیا ہے۔ اس کے لیے شکریہ۔ چند تازہ اشعار سن لیجیے ؎

کیا کیا نہ سیاہیوں نے گھیرا
اللہ یہ رات، یہ اندھیرا

زلفیں تو کریں گی ہی اندھیرا
گھونگھٹ نے بھی چندرلوک گھیرا

پھر شام ہوئی، گلی سے نکلے
پھر صبح ،پھر اس گلی کا پھیرا

یہ رات کہیں کٹے تو دیکھیں
افشاں سے بکھیرتا سویرا

اڑنا وہی سات آسماں پر
آخر وہی ڈال پر بسیرا

یہ راتوں رات ہوگیا کیا
آن داتا آپ کا، نام میرا

کل 12 اشعار ہیں۔ باقی پھر۔ اور کیا لکھوں۔ بھائی ، اپنا خیال رکھیے۔ ہم تو اب بجھتے ہوئے چراغ ہیں، کوئی دم میں لو کھو دیں گے۔ آپ کا نام ہو رہا ہے۔ میں خوش ہوں"۔

خط مورخہ 8 فروری 1989ء

آپ کے، وجے ارون اور وسیم صاحب کے کلام کو اصلاح کر کے بھیجے ہوئے ایک مدت ہوگئی مگر آپ کی طرف سے کوئی جواب نہیں ۔ کیا وہ کلام چھپنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ لکھیئے۔

میں پورا اکتوبر راجھستان کے دورے پر رہا ۔ نومبر کے شروع میں واپس آیا ۔ آتے ہی بیمار پڑ گیا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں شدید درد رہنے لگا ہے۔ اب یہ حال ہے کہ پچاس قدم چلنا دشوار ہے۔ تین مہینے سے اسی عالم میں ہوں۔ لکھنا پڑھنا بھی بقدر شوق ہی ہے۔ علاج جاری ہے۔ کچھ افاقہ بھی ہے۔

دو کتابیں شائع ہوئیں ہیں ، ایک "نازش ادب" از ڈاکٹر تارا چرن رستوگی جو مجھ پر ہے اور دوسری "غالبیات۔ چند شخصی اور غیر شخصی حوالے" کبھی بھیجوں گا۔ ایک تازہ غزل جو کسی کی فرمائش پر اودے پور میں فی البدیہہ کہی تھی۔ آپ بھی سن لیجیے۔

روٹھ کر جانے کی کیا کیا نہ نشانی دے گا
روز یاد آئے گا وہ روز کہانی دے گا

سوچ کر دل مجھے وہ مصرع ثانی دے گا
جاگ اٹھے گا قلم، حرف جوانی دے گا

کوئی کیونکر میری نگری میں رہے گا پیاسا
خشک پتھر بھی نچوڑو گے تو پانی دے گا

کوئی تو لائے گا مٹھی میں ہوائیں بھر کر
کوئی تو ٹھہرے سمندر کو روانی دے گا

فصل گل جا چکی ہے، اب نکہت گل تو ٹھہرے
کون ان ادھ کھلی کلیوں کو جوانی دے گا

اے رضا! میں ہوں وہ فرہنگ کہ جس میں آ کر
لفظ فرحت بھی مصیبت کے معانی دے گا

خط مورخہ 21 جون 1990ء

مجھے امید ہے آپ بحسن وخوبی اپنا کام ختم کر کے انگلینڈ سے واپس آ گئے ہوں گے۔ بعد از حک واصلاح آپ کا کلام مولانا متین کے پاس لوٹا رہا ہوں۔

مولانا آتے ہی دوسرے روز ہمارے یہاں تشریف لائے تھے۔ ان کا مزاج پسند آیا۔ آپ کو معلوم ہے مجھے سب لوگ پسند نہیں آتے۔ انہیں اسی روز جون پور جانا تھا۔ پھر ایک دفعہ واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک حادثہ گزر گیا جس کی تفصیل وہ آپ کو خود بتائیں گے۔ اب وہ پرسوں سے واپسی کے لیے بمبئی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ کل شیوں (آپ کے آبائی گاؤں) گئے ہوں گے اور آج شام کو آ جائیں گے۔ کل شاید ملاقات ہو۔ پرماتما نیکوں کے لیے رحیم وکریم ہے اور بدوں کے لیے قہار وجبار۔ اور کیا لکھوں۔ ایک غزل کے چند شعر لکھتا ہوں ؎

درد دل سے دل لگی تک کس لیے
میرے دکھ پہنچیں کسی تک کس لیے

شاید اشکوں کا مزا کچھ اور ہے
روک لی تم نے ہنسی تک کس لیے

کان میں چپکے سے میرے ڈال دو
بات اپنی، اپنے ہی تک کس لیے

دو ہی پل میں فصل غم پکنے کو ہے
انتظار اگلی صدی تک کس لیے

کوئی رستہ باڑھ سے ہوکر بھی ہے
ورنہ پگڈنڈی ندی تک کس لیے

خط مورخہ 17 ستمبر 1991ء

اگر نیروبی میں آپ کی جان کو امان نہیں تو ترک وطن ہی میں عافیت ہے۔ عمر اور صحت پرماتما کی عنایتیں ہیں وہ جب تک اپنا سایہ رکھے کوئی بال بانکا نہیں کرسکتا۔ تاہم اپنے تمام تر انتظامات کے بعد ہی توکل علی اللہ واجب ہے۔ باقی یہ کہ اس کی نعمتوں کے شکر گزار رہیے۔ بہت سی آفتیں سر سے گزر گئیں یہ بھی گزر جائے گی۔

''کالی داس گپتا رضا کے برجستہ اشعار'' کا زیروکس بھیجا جارہا ہے۔ اگر پسند آئے تو جہاں بھی بھجوانا چاہیں بھجوا سکتے ہیں ۔ یہاں بھی چھپ جائے گا۔ اس میں کوئی واقعہ غلط نہیں اور کسی شعر میں ترمیم نہیں کی گئی۔ مضمون جیسا آپ نے لکھا تھا وہی ہے۔ میں نے صرف توثیق کردی ہے ایک کتاب ابھی چند روز ہوئے ''بہار اردو گلشن مشرقی افریقہ میں '' کے نام سے مکمل کی ہے ۔ ڈیڑھ پونے دو سو صفحوں کو محیط ہوگی۔ میں نے طے کیا ہے کہ اس پر دیباچہ آپ کی طرف سے ہو۔ چند اشعار ؎

لاکھ سوچا کیے ہم، ہوا کچھ نہیں
زندگی آرزو کے سوا کچھ نہیں

کل بھی بنجر تھی دل کی زمین ، آج بھی
بیج بوتے رہے پر اگا کچھ نہیں

اپنی رسوائیوں سے ، نہ گھبرایئے
سب مرے نام ہے آپ کا کچھ نہیں

ہم کو وجدان کا ایک لمحہ بہت
سالہا کچھ نہیں، قرن ہا کچھ نہیں

خط مورخہ 18 مئی 1995ء

یہ خط پریس میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ دیوان غالب دو تہائی چھپ چکا ہے۔ چند روز ہوئے انجم عباسی صاحب ملے تھے۔ ترسیل کا نیا شمارہ چھپ گیا ہے۔ کہتے تھے کہ وہ لے کر آئیں گے۔ لیکن تا حال نہیں آئے۔ میں نے ابراہیم بغدادی کے مضامین کے مجموعے کے بارے میں دریافت کیا تھا، بالکل سرسری طور پر۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مضامین انہوں نے کسی کو ترتیب کے لیے دیئے ہیں اس میں کچھ وقت لگ سکتا ہے۔ کاغذ بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ مجھے بھی دیوان غالب کے لیے کاغذ کی خرید میں سات ہزار روپے زیادہ دینے پڑے۔

تازہ کلام شائع کرانے سے پہلے ذرا اصلاحات اور ترامیم اچھی طرح دیکھ لیں۔ پچھلے مجموعے میں کچھ کمزور کلام شامل ہو گیا تھا۔ اس طرح بنا ہوا معیار کم ہو جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ ایک تازہ غزل کے چند اشعار سنیے ؎

چاہو تو حساب دیکھ لینا
رکھی ہے کتاب دیکھ لینا

ٹھہرا چکے ہم کو گنہگار
اپنا بھی حساب دیکھ لینا

آتا ہے رتوں کے نغمہ گر کو
پت جھڑ میں گلاب دیکھ لینا

خط مورخہ 29 جولائی 1995ء

آپ نے پریس (جو خسارے میں چل رہا ہے) کا کیا کیا۔ آپ کی صحت اور عمر اجازت نہیں دیتی کہ آپ خواہ مخواہ کے جھنجھٹوں میں پھنسیں۔ ذرا ضبط سے کام لیں۔ اگر پرماتما رزق دے رہا ہے تو نماز شکر ادا کیا کیجیے اور علمی و ادبی کام بیشتر

کیجیے۔آپ چند مہینے پہلے یہاں آئے تھے تو کچھ کھل کر بات نہیں ہو سکی تھی ورنہ میں آپ کو کچھ اور ادبی کاموں کی ترغیب دیتا۔ جو آپ کی زندگی کے بعد بھی آپ کے نام کو روشن رکھیں۔آپ کے یہ کام میرے جیتے جی ہو سکتے ہیں بعد میں شاید ممکن نہ ہوں۔ بہت سے عزیز واحباب مجھ سے وابستہ ہیں اور میں سب کی فلاح اور بہبود کے لیے اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتا ہوں۔اس لیے آپ سے بھی کہا ہے۔ورنہ مجھے پرماتما نے بہت دے رکھا ہے۔

انجم عباسی صاحب نہیں ملے۔تازہ شمارہ بھی انہوں نے نہیں دیا۔اس لیے فی الحال ابراہیم بغدادی کی کتاب کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔اس پر مختصر دیباچہ تو میں نے لکھ دیا تھا"۔

میں نے اوپر خطوں سے چند اقتباسات دے دیے ہیں۔یہ وہ خط ہیں جو میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں۔بہت سے خط ،دستاویزات اور اصلاحیں تبدیلی ملک کے دنوں میں ضائع ہو گئے۔ذیل کا خط رضا صاحب نے میرے دریافت کرنے پر لکھا تھا۔اس کا یہ اقتباس بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس مضمون کے لکھنے تک کا آخری خط ہے۔

خط مورخہ 25 اگست 1999ء

مختصر آپ کے استفسارات کا جواب یہ ہے

ا۔آج سے میری عمر کا 75 واں سال شروع ہوتا ہے۔مجھے بیس پچیس سال پہلے تک اپنی صحیح تاریخ ولادت کا علم نہ تھا۔ایک روز،اتفاقیہ ہمارے خاندانی قدیم روزنامچے سے (جو ڈھائی من وزنی ہے) میرے والد کے ہاتھ کا اندراج نکل آیا۔اس سے معلوم ہوا کہ میری ولادت 7 بھادوں 1882 وکرمی (مطابق 25 اگست 1925ء) کو شام کے 6 بج کر 17 منٹ پر ہوئی تھی۔

۲۔جنم ضلع جالندھر کے مشہور قصبہ مکند پور میں ہوا تھا۔حرف اردو ادب کے لحاظ سے جوش ملسیانی،عرش ملسیانی،غلام رسول مہر،عبدالعزیز خالد،ابن انشاء وغیرہ مشاہیر اسی ضلع جالندھر کی سرزمین سے اٹھے۔

۳۔میری آج تک ساٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔چودہ شاعری،انیس غالبیات اور ستائیس متفرق موضوعات پر۔تقریباً مزید بیس کتابوں کا مواد بھی اشاعت کا منتظر ہے۔

اس طرح میں نے اب تک لگ بھگ تیس ہزار اشعار اور بیس ہزار صفحے نثر میں لکھتے۔

جناب کالی داس گپتا رضا کی ذات بہت غنیمت ہے۔ان کی صلاحیتوں اور کارناموں کے علاوہ ان کا ذخیرہ کتب بھی ایک کارنامے سے کم نہیں۔ان کے کتب خانے میں دنیا کا سب سے بڑا ذخیرہ غالبیات شامل ہے جس میں دو ہزار سے زائد کتابیں ،رسالے اور دستاویزات ہیں۔زیادہ کیا کہا جائے۔ان سے ملاقات کے معنے مجسم اردو ادب سے ملاقات ہے۔